ہمدردشوریٰ پاکستان

مدیراعلیٰ: قومی صدر ہمدردشوریٰ پاکستان
محترمہ سعدیہ راشد

اگست 2026

جلد.....07
شمارہ:2026

موضوع فکر

''فلم، تھیٹر اور ڈرامے:
معاشرے کی اصلاح کے مؤثر ذرائع''

.....نکاتِ فکر ہمدردشوریٰ.....

اجلاس کراچی	12/اگست2026
اجلاس پشاور	11/اگست 2026
اجلاس راولپنڈی/ اسلام آباد	04/اگست2026
اجلاس لاہور	05/اگست2026

ترتیب وپیشکش
ایونٹس/ پروگرام
ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، مرکزی دفتر کراچی
16ویں منزل، بحریہ ٹاؤن ٹاور، پی ای سی ایچ ایس بلاک 2،
کراچی پاکستان75400 ٹیلی فون021-38241611

مرتب کردہ:
ڈاکٹر ثناء غوری

رپورٹ
ڈاکٹر ثناء غوری کراچی
محمد نعمان قیوم پشاور
محمد امان اللہ نیازی راولپنڈی/اسلام آباد
سید علی بخاری لاہور

ہمدردشوریٰ کے اراکین کی رائے سے
ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

ہمدرد شوریٰ۔ اگست 2026ء
موضوع بحث:
''فلم، تھیٹر اور ڈرامے: معاشرے کی اصلاح کے مؤثر ذرائع''

فلم، ڈراما اور تھیٹر محض تفریح کے ذرائع نہیں، بلکہ معاشرے کی فکری، اخلاقی اور سماجی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنے والے مؤثر ذرائع ہیں۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے، جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے اور جن کرداروں اور کہانیوں سے متاثر ہوتا ہے، وہ سب اس کی سوچ، رویوں اور ترجیحات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی لیے فنونِ لطیفہ کو معاشرتی تبدیلی کے ایک طاقتور وسیلے کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔

کسی معاشرے کی اصلاح صرف قوانین بنانے یا نصیحتیں کرنے سے ممکن نہیں ہوتی۔ لوگوں کے رویوں میں تبدیلی کے لیے ایسے ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے جو اُن کے جذبات اور ذہن دونوں تک رسائی حاصل کرسکیں۔ فلم اور ڈراما اس اعتبار سے غیر معمولی اثر رکھتے ہیں۔ ایک اچھا کردار، ایک مؤثر کہانی اور ایک حقیقی زندگی سے قریب منظر ناظر کو اس طرح متاثر کرسکتا ہے کہ وہ برسوں تک اس کے ذہن میں محفوظ رہتا ہے۔ یہی اثر اگر مثبت مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو معاشرتی رویوں کی اصلاح میں نمایاں کردار ادا کرسکتا ہے۔

فلم اور ڈرامے میں معاشرے کے مختلف طبقات، ان کے مسائل اور ان کی زندگیوں کو جس انداز میں پیش کیا جاتا ہے، اس سے لوگوں میں دوسروں کے حالات کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا ہوسکتی ہے۔ غربت، تعلیم کی کمی، طبقاتی تفاوت، خواتین کے مسائل، بچوں کے حقوق، بزرگوں کی ضروریات، خاندانی تعلقات اور معاشرتی ناانصافی جیسے موضوعات کو محض مسئلے کے طور پر دکھانے کے بجائے ان کے ممکنہ حل بھی کہانی کا حصہ بنائے جائیں تو ناظرین میں اجتماعی ذمے داری کا احساس پیدا کیا جاسکتا ہے۔

میڈیا کی سب سے بڑی طاقت یہ ہے کہ یہ کسی تصور کو محض بیان نہیں کرتا، بلکہ اسے کردار اور واقعے کی صورت میں انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایک شخص شاید طویل تقریر سن کر کسی مسئلے کو بھول جائے، لیکن ایک مؤثر کہانی میں دکھایا گیا واقعہ اس کے ذہن میں دیر تک موجود رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی شخصیت سازی میں فلم، ڈراما اور تھیٹر کا کردار خاص اہمیت رکھتا ہے۔

تاہم اس اثر کو صرف مثبت تصور کرنا بھی درست نہیں۔ اگر مسلسل ایسے کردار دکھائے جائیں جن میں تشدد، دھوکا دہی، غیر ذمے داری، نمود و نمائش یا دوسروں کو کمتر سمجھنے کے رویے کو کامیابی کی علامت بنایا جائے تو ناظرین، خصوصاً کم عمر افراد، ان رویوں کو معمول سمجھنے لگ سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر دولت مند زندگی کو غیر حقیقی شان و شوکت کے ساتھ اور محروم طبقے کو محض ترس کے قابل بنا کر پیش کیا جائے تو معاشرے میں احساسِ محرومی اور طبقاتی فاصلے مزید بڑھ سکتے ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ تخلیق کار اس بات کا خیال رکھیں کہ تفریح اور کاروباری کامیابی کے ساتھ ان کے کام کے سماجی اثرات بھی موجود ہوتے ہیں۔ عوام جس مواد کو پسند کرتے ہیں، وہی زیادہ آگے بڑھتا ہے، لیکن مقبولیت کو واحد معیار نہیں بنایا جاسکتا۔ معیاری تخلیق وہ ہے جو ناظر کو محظوظ کرنے کے ساتھ اسے کچھ سوچنے، محسوس کرنے اور اپنے رویے پر نظر ثانی کرنے کا موقع بھی دے۔

خواتین کی نمائندگی بھی اسی تناظر میں اہم ہے۔ عورت کو صرف ظاہری شخصیت، رومانوی کردار یا کہانی کے کسی ثانوی حصے تک محدود کرنے کے بجائے اسے ایک مکمل انسان کے طور پر پیش کیا جانا چاہیے، جو فیصلے کرسکتی ہو، مشکلات کا سامنا کرسکتی ہو اور معاشرے کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرسکتی ہو۔ اسی طرح مرد کرداروں میں بھی طاقت اور غلبے کے بجائے ذمے داری، برداشت، احترام اور انسانی ہمدردی کو نمایاں کیا جاسکتا ہے۔

تھیٹر اور فلم کو معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان مکالمے کا ذریعہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ مختلف خیالات رکھنے والے افراد اور گروہوں کو سمجھنے کے لیے کہانیاں ایک ایسا ماحول پیدا کرتی ہیں جہاں اختلاف دشمنی میں تبدیل ہوئے بغیر سامنے آسکتا ہے۔ ایک صحت مند معاشرہ وہی ہوتا ہے جہاں لوگ مختلف خیالات سننے، سوال کرنے اور اپنے نقطہ نظر پر نظر ثانی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

آج ڈیجیٹل ذرائع نے اس عمل کو مزید وسیع کردیا ہے۔ اب کسی فلم یا ڈرامے کا اثر صرف سینما یا ٹیلی وژن تک محدود نہیں رہتا، بلکہ سوشل میڈیا کے

ذریعے چند لمحوں میں لاکھوں افراد تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کے مثبت پہلو کے ساتھ غلط معلومات، افواہوں اور گمراہ کن مواد کا خطرہ بھی موجود ہے۔ اس لیے نئی نسل کو صرف مواد دیکھنے والا نہیں، بلکہ اسے سمجھنے، جانچنے اور اس کے اثرات کو پہچاننے والا فرد بنانا ضروری ہے۔

یہاں تعلیمی اداروں کا کردار بھی اہم ہو جاتا ہے۔ اگر نوجوانوں میں سوال کرنے، دلیل سمجھنے اور درست وغلط میں فرق کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے تو وہ میڈیا کے اثرات کو زیادہ شعوری انداز میں قبول کریں گے۔ میڈیا اور تعلیم ایک دوسرے کے متبادل نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی معاون قوتیں بن سکتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ معاشرتی اصلاح کسی ایک ادارے یا طبقے کی ذمے داری نہیں۔ حکومت، تعلیمی ادارے، میڈیا، فنکار، والدین اور خود ناظرین سب اس عمل کا حصہ ہیں۔ حکومت اور متعلقہ اداروں کی ذمے داری ہے کہ وہ قانون اور ضابطے کے دائرے میں رہتے ہوئے معیار اور ذمے داری کو یقینی بنائیں، جب کہ تخلیق کاروں کی ذمے داری ہے کہ وہ آزادی اور تخلیقی صلاحیت کو معاشرتی ذمے داری کے ساتھ استعمال کریں۔

فلم، ڈراما اور تھیٹر وہی کردار ادا کر سکتے ہیں جو ہم ان کے لیے متعین کرتے ہیں۔ اگر انہیں صرف منافع اور وقتی مقبولیت کا ذریعہ سمجھا جائے تو ان کی طاقت محدود ہو جاتی ہے، لیکن اگر انہیں انسانی رویوں، مثبت اقدار، شعور اور اجتماعی ذمے داری کے فروغ کے لیے استعمال کیا جائے تو یہی ذرائع معاشرے میں خاموش، مگر گہری تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ معاشرتی اصلاح ایک طویل عمل ہے، مگر ایک اچھی کہانی کسی ایک فرد کی سوچ بدل کر اس عمل کا آغاز ضرور کر سکتی ہے۔

موضوع کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے، ہمدرد شوریٰ پاکستان کی قومی صدر محترمہ سعدیہ راشد صاحبہ نے ہمدرد شوریٰ پاکستان کے اجلاس اگست 2026ء کے لیے فلم، تھیٹر اور ڈرامے: معاشرے کی اصلاح کے مؤثر ذرائع کو موضوعِ بحث تجویز کیا۔ اس اجلاس کا انعقاد پاکستان کے مختلف شہروں، پشاور، راولپنڈی/ اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں کیا گیا۔ مجالس کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے کیا گیا۔ محترمہ سعدیہ راشد صاحبہ، قومی صدر ہمدرد شوریٰ پاکستان نے اپنے پیغام میں اراکینِ شوریٰ کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہوئے اپنے خط میں تحریر فرمایا کہ فلم، تھیٹر اور ڈراما معاشرے کی سوچ، اقدار اور کردار سازی پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ماضی میں پاکستانی ڈرامے اور فلمیں ہماری تہذیب، خاندانی روایات اور سماجی مسائل کی بہترین عکاسی کرتی تھیں، لیکن آج کئی تخلیقات میں غیر ضروری بے باکی، سطحیت اور مغربی تقلید بڑھتی جا رہی ہے، جو ہماری ثقافتی اور دینی اقدار سے ہم آہنگ نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمثیلی ابلاغ کو قومی تعمیر، اخلاقی تربیت اور مثبت سماجی تبدیلی کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس ضمن میں پیمرا اور سینٹرل بورڈ آف فلم سنسرز کا کردار نہایت اہم ہے۔ یہ ادارے ایسے معیارات نافذ کریں جو معیاری، بامقصد اور خاندانی اقدار کے مطابق مواد کی حوصلہ افزائی کریں، جب کہ معاشرتی بگاڑ اور اخلاقی انحطاط کا باعث بننے والے مواد کی مؤثر روک تھام کریں۔ میں معزز اراکینِ شوریٰ سے گزارش کرتی ہوں کہ ہم مل کر اس بات پر غور کریں کہ فلم، تھیٹر اور ڈرامے کو کس طرح معاشرتی اصلاح، قومی یکجہتی اور اخلاقی اقدار کے فروغ کا مؤثر ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

ہمدرد شوریٰ (کراچی) اجلاس

ہمدرد شوریٰ (کراچی) کا اجلاس صدر ہمدرد شوریٰ پاکستان محترمہ سعدیہ راشد کی زیرِ صدارت منعقد کیا گیا۔ اجلاس میں محترم لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر (اسپیکر)، محترم کرنل (ر) مختار احمد بٹ (ڈپٹی اسپیکر)، کموڈر (ر) سدید انور ملک، محترم مظفر اعجاز، محترم ظفر اقبال، محترم مبشر میر، محترم انجینئر ابن الحسن رضوی، محترمہ پروفیسر ڈاکٹر تنویر خالد، محترمہ شہلا احمد، محترم بریگیڈیئر (ر) طارق خلیل، محترم پروفیسر ڈاکٹر امجد علی جعفری، محترم بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر ریاض الحق، محترم انجینئر پرویز صادق، محترم سینٹر عبدالحسیب خان، محترم ڈاکٹر جعفر احمد، محترمہ پروفیسر ڈاکٹر خالدہ غوث، محترمہ مسرت اکرم، محترمہ نوشابہ خلیل، محترم پروفیسر ڈاکٹر عمران امین، ڈائریکٹر پروگرامز اینڈ سی ایس آر، ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان سید محمد ارسلان، سینئر منیجر پروگرامز اینڈ ایونٹس محترمہ ڈاکٹر ثناء غوری صاحبہ نے شرکت فرمائی۔ محترم پروفیسر ڈاکٹر عرفان عزیز، ممتاز ماہرِ

تعلیم، محقق اور میڈیا اسکالر (ایچ او ڈی ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ، فیڈرل اردو یونی ورسٹی) کو بطور مہمان مقرر مدعو کیا گیا۔

اجلاس کے آغاز میں ڈاکٹر ثناء غوری نے فرمایا کہ آج کا یہ اجلاس اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ رواں سال 2026ء میں ہمدرد شوریٰ پاکستان کے قواعد وضوابط باقاعدہ طور پر شائع ہو چکے ہیں، جن میں ہمدرد شوریٰ پاکستان کے تمام قواعد، ذمے داریوں اور طریقہ کار کو مرتب کیا گیا ہے۔ ان قواعد کو اسی فکر اور طریقہ کار کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہے جس کی بنیاد شہید حکیم محمد سعید نے رکھی تھی۔ یہاں موجود نوجوانوں کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ہمدرد شوریٰ پاکستان کیا ہے اور اسے قائم کرنے کا مقصد کیا ہے؟

ہمدرد شوریٰ پاکستان ایک فکری اور دانشورانہ فورم ہے، جس کا مقصد پاکستان کے اہم معاشی، سیاسی، سماجی اور قومی امور پر غور وفکر کرنا، ان کا جائزہ لینا اور ملک وقوم کی بہتری کے لیے قابلِ عمل تجاویز پیش کرنا ہے۔ اس فورم میں ایسے اہلِ فکر و دانش کو شامل کیا جاتا ہے جو اپنے اپنے شعبوں میں مہارت، تجربہ اور بصیرت رکھتے ہیں اور معاشرے میں مثبت تبدیلی لانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آج اس اجلاس میں موجود ہر شخص اپنے اپنے شعبے کا ایک تجربہ کار اور صاحبِ علم فرد ہے، جس نے پاکستان کی بہتری کے لیے اپنے اپنے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو یہاں موجود ہر فرد اپنے شعبے کا ایک تراشا ہوا ہیرا ہے۔

ہمدرد شوریٰ پاکستان کی سرگرمیاں صرف کراچی تک محدود نہیں۔ کراچی کے علاوہ راولپنڈی/اسلام آباد، لاہور اور پشاور میں بھی ہر ماہ اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ اس طرح پاکستان کے مختلف بڑے شہروں میں یہ فکری سلسلہ جاری ہے۔ ہمدرد شوریٰ پاکستان کے اجلاس میں ہونے والی گفتگو اور پیش کی جانے والی تجاویز صرف اس نشست تک محدود نہیں رہتیں۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے ان خیالات اور تجاویز کو عوام تک پہنچایا جاتا ہے، اخبارات میں ان کی اشاعت ہوتی ہے، سوشل میڈیا کے ذریعے بھی انہیں اجاگر کیا جاتا ہے اور اجلاس کی رپورٹ باقاعدہ شائع کی جاتی ہے۔ شوریٰ کی سفارشات متعلقہ حکومتی اداروں، منتخب نمائندوں اور دیگر متعلقہ فورمز تک بھی پہنچائی جاتی ہیں، تاکہ اہلِ فکر کی یہ آواز قومی پالیسی اور عملی اقدامات کا حصہ بن سکے۔

اس فکری سفر کی تاریخ بھی بہت اہم ہے۔ 1961ء میں شامِ ہمدرد کے نام سے اس سلسلے کا آغاز ہوا، جو بعد ازاں ہمدرد شوریٰ پاکستان کی صورت میں آگے بڑھا اور باقاعدہ ایک ادارہ جاتی شکل اختیار کی۔ 1995ء میں ہمدرد شوریٰ پاکستان کی باقاعدہ تشکیل عمل میں آئی۔ حکیم محمد سعید شہید کی فکر اور ہمدرد کے پلیٹ فارم سے مختلف علمی، فکری، قومی اور بین الاقوامی سطح کی سرگرمیوں کا یہ سلسلہ مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ سیرت کانفرنسوں سے لے کر مختلف قومی و عالمی کانفرنسوں تک ہمدرد نے ہمیشہ علم، فکر اور مکالمے کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ آج کے اجلاس کے انعقاد کے حوالے سے ایک اہم بات یہ ہے کہ ماضی میں ہمدرد شوریٰ پاکستان (کراچی) کے اجلاس ہمارے دفتر میں منعقد ہوتے رہے ہیں، لیکن وہاں ایک کمی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نوجوانوں، بالخصوص یونی ورسٹی کے طلبہ کو ان فکری نشستوں میں اس طرح شامل نہیں کر پا رہے تھے جس طرح ہم چاہتے تھے۔ مبصرین کی شرکت بھی جگہ کی محدودیت کے باعث ممکن نہیں ہو رہی تھی۔ اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس مرتبہ کوشش کی گئی ہے کہ نوجوانوں اور مبصرین کو بھی ہمدرد شوریٰ کے اجلاس کا حصہ بنایا جائے۔ ہمارے قواعد وضوابط میں بھی طلبہ اور مبصرین کی شرکت کی گنجائش موجود ہے۔

پاکستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ نوجوانوں کو صرف مستقبل کے نمائندے سمجھنے کے بجائے آج کی قومی گفتگو کا حصہ بھی بنایا جائے۔ انہیں یہ موقع ملنا چاہیے کہ وہ ملک کو درپیش مسائل کو سنیں، ان پر غور کریں، سوال کریں اور اپنی رائے کا اظہار کریں۔

اس سلسلے میں محترمہ سعدیہ راشد کی رہنمائی ہمارے لیے نہایت اہم ہے۔ نوجوانوں، بالخصوص یونی ورسٹی کے طلبہ کو ایسے فکری پروگراموں میں شامل کرنے کی ضرورت پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے۔ معاشرے کو کس سمت میں لے کر چلنا ہے، کن امور پر کام کرنا ہے اور نئی نسل کو کس طرح قومی دھارے سے جوڑنا ہے، ان تمام معاملات میں ان کی رہنمائی ہمارے لیے ایک اہم رہنما اصول ہے۔ اس پروگرام کی تشکیل میں ڈائریکٹر

پروگرامز اینڈ سی ایس آر سید محمد ارسلان کی بھی خصوصی رہنمائی شامل رہی۔

ہمدرد شوریٰ پاکستان کے اراکین اپنے اپنے شعبوں میں ماہر اور صاحبِ رائے افراد ہیں۔ یہاں گفتگو کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر اجلاس میں بہت بڑی تعداد میں سامعین یا آبزرورز موجود ہوں تو ممکن ہے بعض اوقات شوریٰ کے اراکین اپنے خیالات کے اظہار میں وہ آزادی محسوس نہ کریں جو ایک فکری فورم کے لیے ضروری ہے۔ انسان بعض اوقات خود ہی اپنے اظہار پر ایک حد مقرر کر لیتا ہے کہ کون سی بات کہنی ہے اور کون سی بات نہیں کہنی۔

آج کا دور ذرائع ابلاغ اور بالخصوص سوشل میڈیا کا دور ہے۔ پاکستان بننے کے بعد سے آج تک کے حالات پر نظر ڈالیں تو موجودہ دور اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک مشکل ترین دور دکھائی دیتا ہے۔ ایسے ماحول میں کسی بھی فکری گفتگو کو عوام تک پہنچاتے ہوئے ذمے داری اور احتیاط دونوں ضروری ہیں۔ بعض اوقات ادارتی ضرورت کے تحت گفتگو کے کچھ حصے محدود یا حذف بھی کرنا پڑتے ہیں، تاکہ کسی غیر ضروری مسئلے کو جنم نہ ملے۔ اسی لیے اس وقت محدود تعداد میں مبصرین کو اجلاس میں شامل کیا گیا ہے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب اور مؤثر ثابت ہوا تو آئندہ بھی اسی مقام پر ایسے اجلاس منعقد کیے جا سکتے ہیں، بصورتِ دیگر کسی اور موزوں مقام کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ اس مقام پر ہمدرد شوریٰ پاکستان (کراچی) کا پہلا اجلاس ہے، اس لیے انتظامی اعتبار سے بھی اسے ایک تجربہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ ہر اجلاس کے ساتھ طریقہ کار اور انتظامات میں مزید بہتری لائی جائے۔ آج چوں کہ ہمارے ساتھ نوجوان مبصرین بھی موجود ہیں اور اجلاس کا موضوع بھی اہم ہے، اس لیے ضروری ہے کہ گفتگو کو موضوع تک محدود اور مختصر رکھا جائے، تاکہ نوجوان شرکاء کو بھی اپنی بات کرنے کا مناسب موقع مل سکے۔ خصوصاً سوال و جواب کا سیشن رکھا گیا ہے، جس میں وہ اپنے سوالات پیش کر سکیں گے، شوریٰ کے اراکین سے براہِ راست مکالمہ کر سکیں گے اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کر سکیں گے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے آج ہم نے نوجوانوں کو اس فکری نشست کا حصہ بنایا ہے۔ تاکہ فکر کا یہ سفر صرف ایک نسل تک محدود نہ رہے، بلکہ نئی نسل بھی اس مکالمے میں شریک ہو اور پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے اپنی ذمے داری کو سمجھ سکے۔

محترم لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر (اسپیکر) نے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ آج کا موضوع نہایت اہم ہے کہ فلم، تھیٹر اور ڈراما معاشرے پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور انہیں معاشرے کی اصلاح اور بہتری کے لیے کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں ٹیلی وژن نسبتاً تاخیر سے آیا، لیکن جب ٹیلی وژن کا آغاز ہوا تو اس پر پیش کیے جانے والے ڈرامے نہایت معیاری ہوتے تھے۔ ان ڈراموں میں ہماری تہذیب، معاشرت اور اقدار کی بھرپور عکاسی ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ڈرامے صرف پاکستان ہی میں مقبول نہیں ہوئے، بلکہ جہاں جہاں اردو سمجھی جاتی تھی، خصوصاً بھارت میں بھی انہیں بہت شوق سے دیکھا جاتا تھا۔ بعد ازاں جنرل ضیاء الحق کا دور آیا۔ اس زمانے میں ٹیلی وژن پر سخت کنٹرول تھا اور ڈرامے تقریباً صرف اردو زبان میں پیش کیے جاتے تھے۔ آج جس طرح پشتو، سندھی اور دیگر زبانوں کے الگ چینلز موجود ہیں، اس وقت یہ صورتِ حال نہیں تھی۔ ٹیلی وژن کے مواد پر بہت سی پابندیاں عائد تھیں اور ڈراموں سمیت دیگر پروگراموں میں بھی مختلف نوعیت کی قدغنیں موجود تھیں۔ اس کے بعد ایک ایسا دور آیا جب حکومت نے میڈیا کو نسبتاً آزادی دی اور پاکستان میں بڑی تعداد میں نجی ٹیلی وژن چینلز قائم ہوئے۔ مختلف بڑے اخبارات، جن میں ڈان اور جنگ بھی شامل ہیں، اپنے اپنے ٹیلی وژن چینلز لے کر آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ CNN اور دیگر بین الاقوامی چینلز بھی پاکستان میں دستیاب ہونے لگے۔ لوگوں نے ڈش انٹینا لگائے اور دنیا بھر کے درجنوں، بلکہ سو سے زائد چینلز تک رسائی حاصل کر لی۔ ظاہر ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک سے آنے والا ہر طرح کا مواد ہماری ثقافت اور اخلاقی اقدار سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ جب یہ غیر ملکی پروگرام لوگوں، خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کے لیے آسانی سے دستیاب ہوئے تو ان کے اثرات بھی مرتب ہونا فطری امر تھا۔

تھیٹر بھی معاشرے پر اثر انداز ہونے والا ایک اہم ذریعہ ہے۔ لاہور میں تھیٹر کی روایت خاصی

مضبوط رہی ہے، جب کہ کراچی میں بھی آرٹس کونسل سمیت مختلف مقامات پر تھیٹر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم لاہور میں تھیٹر کا دائرہ نسبتاً وسیع رہا اور وقت کے ساتھ بعض مقامات پر اس میں غیر سنجیدہ اور اخلاقی معیار سے گرا ہوا مواد بھی شامل ہوتا چلا گیا۔ بعد ازاں حکومت نے اس صورتِ حال کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی اور عدالتوں سے بھی اس حوالے سے احکامات حاصل کیے گئے، کیوں کہ بعض تھیٹرز میں فحاشی اور غیر اخلاقی عناصر نمایاں ہو گئے تھے۔ یہ مسئلہ صرف الحمرا تک محدود نہیں تھا بلکہ لاہور کے دیگر تھیٹرز میں بھی ایسی صورتِ حال دیکھنے میں آئی۔

آج مسئلہ صرف سینما، ٹیلی وژن یا تھیٹر تک محدود نہیں رہا۔ نامناسب اور غیر اخلاقی نوعیت کی فلمیں اور دیگر مواد یوٹیوب اور مختلف ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر بھی با آسانی دستیاب ہیں۔ گزشتہ پندرہ، بیس برس سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض ہوٹلوں، ڈھابوں اور چائے خانوں میں، جہاں کم عمر بچے بھی موجود ہوتے ہیں، کاروباری سرگرمی کے ساتھ ایسے مواد کی نمائش بھی کی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کے مناظر اور مواد دیکھنے والے بچوں اور نوجوانوں کے ذہنوں پر کس نوعیت کے اثرات مرتب ہوں گے اور مستقبل میں ان کے رویوں پر اس کے کیا نتائج سامنے آسکتے ہیں؟

مختلف سروے بھی اس امر کی جانب اشارہ کرتے رہے ہیں کہ پاکستان میں غیر اخلاقی نوعیت کے آن لائن مواد کی طرف رجحان اور اس کی عادت ایک قابلِ توجہ مسئلہ بن چکی ہے۔ اس کے ساتھ ٹک ٹاک اور یوٹیوب جیسے پلیٹ فارمز نے بھی ہماری زندگی کا حصہ بن کر مواد کی ایک نئی دنیا کھول دی ہے، جہاں ہر نوعیت کی چیز آسانی سے دستیاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے متعدد ممالک میں اب بچوں کے لیے سوشل میڈیا اور بعض ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے استعمال پر عمر کی پابندیوں اور دیگر ضوابط پر غور کیا جا رہا ہے۔ آسٹریلیا سمیت کئی ممالک میں اس حوالے سے اصلاحات اور نئے ضوابط متعارف کرائے جا رہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ بچوں کے ذہن اور ان کی نفسیاتی و سماجی نشوونما پر منفی اثرات کے خدشات ہیں۔ دنیا کے بعض معاشروں میں اسکولوں میں فائرنگ اور تشدد کے واقعات بھی سامنے آئے ہیں۔ اس حوالے سے یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ بعض پرتشدد ویڈیوز، گیمز اور دیگر ڈیجیٹل مواد بچوں اور نوجوانوں کے ذہنوں کو کس حد تک متاثر کرتے ہیں اور ان کے رویوں میں تشدد کے رجحانات کو کس حد تک تقویت مل سکتی ہے۔

پاکستان میں فلمی مواد کی نگرانی کے لیے فلم سینسر بورڈ موجود ہے، جس کی ذمے داری سینما میں ریلیز ہونے والی پاکستانی اور غیر ملکی فلموں کا جائزہ لینا ہے۔ دوسری جانب ٹیلی وژن پر نشر ہونے والے مواد، جن میں ڈرامے بھی شامل ہیں، کی نگرانی کی ذمے داری پیمرا کے دائرہ کار میں آتی ہے۔ یہ تمام صورتِ حال اس بات کی متقاضی ہے کہ فلم، تھیٹر، ڈراما اور نئے ڈیجیٹل ذرائع ابلاغ کے معاشرے پر اثرات کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے اور یہ سوچا جائے کہ ان ذرائع کو محض تفریح کے بجائے معاشرے کی بہتری، اخلاقی تربیت اور مثبت شعور کے فروغ کے لیے کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اسی موضوع پر مزید تفصیلی گفتگو کے لیے آج ہمارے ساتھ ایک ممتاز ماہرِ تعلیم، محقق اور میڈیا اسکالر موجود ہیں، جن کی علمی اور تحقیقی خدمات اس شعبے میں قابلِ قدر ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر عرفان عزیز ہمارے ساتھ بطور مہمانِ مقرر موجود ہیں۔ امید ہے کہ ان کی گفتگو اس اہم موضوع کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرے گی۔

مہمانِ مقررہ محترم پروفیسر ڈاکٹر عرفان عزیز نے اپنے کلیدی خطاب میں فرمایا کہ سب سے پہلے میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہوں گا کہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر صاحب نے جس منظرنامے کی طرف توجہ دلائی ہے، ممکن ہے میں اسے اسی زاویے سے نہ دیکھوں جس زاویے سے اسے پیش کیا گیا ہے۔ شاید بعض نکات پر میری رائے مختلف ہو، لیکن اس اختلاف کو قبول کرنے کی گنجائش ہی دراصل ایک فکری معاشرے کی علامت ہے۔ اگر معین الدین حیدر صاحب کی پیش کردہ صورتِ حال کے بعض نتائج کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو ہمیں اس کے پس منظر میں ان قوانین اور پالیسیوں کو بھی دیکھنا ہوگا جو پاکستان میں میڈیا انڈسٹری کے لیے گزشتہ کئی دہائیوں کے دوران بنائے گئے۔ تقریباً 79 برس کے عرصے میں میڈیا کے حوالے سے براہِ راست

اور بالواسطہ نوعیت کے چالیس سے زائد قوانین بنائے گئے، جب کہ ملک نے طویل عرصے تک براہِ راست یا بالواسطہ سیاسی و عسکری حکمرانی کے ادوار بھی دیکھے ہیں۔ ایسے میں اگر آج ہم میڈیا کی موجودہ صورتِ حال کی تمام تر ذمے داری صرف میڈیا انڈسٹری پر ڈال دیں تو یہ مکمل تصویر نہیں ہوگی۔ اس ذمے داری میں ان لوگوں کا کردار بھی شامل ہے جو ریاست میں قانون سازی کرتے ہیں اور میڈیا کے لیے قواعد وضوابط تشکیل دیتے ہیں۔

پاکستان کو میڈیا کے لیے دنیا کے مشکل ترین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ گزشتہ تقریباً آٹھ دہائیوں میں ہم نے بہت سے سنگین واقعات دیکھے ہیں۔ 1971ء جیسے واقعات ہماری قومی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس لیے شاید ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بنیادی سوالات کی طرف واپس جائیں اور یہ دیکھیں کہ فلم، ڈراما اور تھیٹر دراصل ہمارے معاشرے میں کیا کردار ادا کرتے ہیں۔

انسان نے گزشتہ آٹھ دہائیوں میں شاید سب سے تیزی سے جو چیز کھوئی ہے، وہ اپنی زمین اور اپنے لوگوں سے تعلق کا احساس ہے۔ اسی لیے میں فلم، ڈراما اور تھیٹر کی صورتِ حال کو چند بنیادی سوالات کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہم سب فلمیں دیکھتے ہیں، ڈرامے دیکھتے ہیں اور شاید ہم میں سے کچھ لوگ تھیٹر بھی جاتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے ہاں تھیٹر کی صورتِ حال اب بہت کمزور ہوچکی ہے۔ کراچی میں شاید ایک آدھ ایسا ادارہ یا مقام باقی ہے جہاں تھیٹر کی سرگرمیاں کسی حد تک جاری ہیں۔ سنیما ہالز کی تعداد بھی بہت کم ہوچکی ہے اور ان میں سے کئی مقامات اب تجارتی مراکز میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود فلمیں ہم Youtube,Netflix اور دیگر ذرائع پر بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔

یہاں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے: ہم فلم، ڈراما یا تھیٹر دیکھنے کیوں جاتے ہیں؟ ہم اپنا وقت اور پیسہ کیوں خرچ کرتے ہیں؟ کیا ہم یہ سوچ کر سنیما جاتے ہیں کہ آج ہمیں کوئی نصیحت سننی ہے؟ کیا ہم ڈراما اس لیے دیکھتے ہیں کہ اپنی اصلاح کرنی ہے؟ یا ہم تفریح کے لیے فلم، ڈراما اور تھیٹر دیکھتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ جب ہم ڈراما، فلم یا تھیٹر کے لیے اپنا وقت صرف کرتے ہیں تو ہم بنیادی طور پر تفریح اور ایک معیاری تجربے کے لیے یہ وقت اور پیسہ صرف کر رہے ہوتے ہیں۔ شاید ہی ہم کسی فلم یا ڈرامے کے بعد یہ سوچتے ہوں کہ اس میں ہمارے لیے کیا نصیحت یا اصلاح کا پہلو موجود تھا۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ جو ذرائع بنیادی طور پر تفریح کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں، ہم ان سے اصلاح کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں؟ فلم، ڈراما اور تھیٹر کا بنیادی تعلق کہانی سے ہے اور کہانی صرف تفریح نہیں ہوتی۔ انسان کہانیاں کیوں سنتا ہے؟ کہانیاں کیوں سناتا ہے؟

کہانی سننا اور کہانی سنانا انسان کی امتیازی خصوصیات اور صلاحیتوں میں شامل ہے۔ زمین پر موجود دوسری مخلوقات کے مقابلے میں انسان ہی وہ مخلوق ہے جو کہانیاں سنتی بھی ہے، سناتی بھی ہے اور تخلیق بھی کرتی ہے۔ کتاب کے وجود میں آنے سے پہلے بھی کہانی موجود تھی۔ اخبار آنے سے پہلے بھی کہانی تھی۔ ریڈیو، ٹیلی وژن اور سنیما کے وجود میں آنے سے ہزاروں سال پہلے بھی انسان کہانیاں سناتا تھا۔

بعض ماہرین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ زبان سیکھنے کی ہماری ضرورت کا تعلق بھی اپنی کہانی سنانے کی خواہش سے ہے۔ ہم زبان سیکھتے ہیں، کیوں کہ ہم اپنی کہانی دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح کسی چیز کو سمجھنے کا عمل بھی کہانی سے جڑا ہوا ہے۔ انسان اپنی ذات کو بھی کہانی کے ذریعے سمجھتا ہے۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ میرے لوگ کون ہیں؟ میرے ساتھ کیا ہوا؟ میرے ہیروز کون ہیں؟ میرا مخالف کون ہے؟

کہانیاں ہمیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ کون سچ بول رہا تھا اور کون جھوٹ۔ ہمیں کس کے سچ کا ساتھ دینا چاہیے اور کس کے سچ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے کہانی صرف تفریح نہیں کہانی ہماری شناخت کا حصہ ہے۔

ہماری زندگی کے بہت سے اہم اور غیر اہم فیصلے کسی نہ کسی کہانی سے جڑے ہوتے ہیں۔ جب کسی فرد کی ذاتی کہانی اجتماعی کہانی بن جاتی ہے تو معاملہ مزید دلچسپ ہوجاتا ہے۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ دوسرے صرف ان کی کہانی سنیں۔ کچھ لوگ اپنی ذاتی کہانیوں کو ملا کر ایک اجتماعی کہانی بنا لیتے ہیں اور پھر آنے والی نسلیں بھی اسی کہانی کو دہراتی رہتی ہیں۔ کوئی خود کو ہیرو بناتا ہے، کوئی

کسی دوسرے کو ہیرو بنا کر خود اس کی کہانی کا اہم کردار بن جاتا ہے اور کوئی کسی بڑی قومی، سیاسی، مذہبی یا تہذیبی کہانی میں اپنے لیے جگہ تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح کہانی سماجی، سیاسی اور مذہبی طاقت کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔

یہاں ایک اہم بات یہ ہے کہ کہانی سنانے والا اکثر یہ طے کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو، اس کی کہانی میں ہیرو کون ہوگا؟ ولن کون ہوگا؟ مظلوم کون ہوگا؟ غدار کون ہوگا؟ کافر کون ہوگا؟ سچا کون ہوگا؟

یہ تمام فیصلے کہانی لکھنے یا تشکیل دینے والا کر رہا ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے دنیا کی ہر بڑی جنگ کا ایک اہم محاذ، کہانی کا محاذ بھی ہوتا ہے۔ زمین پر فیصلہ اور حقائق کچھ بھی ہوں، ہر فریق اور ہر جنگجو کی کوشش ہوتی ہے کہ کہانی میں وہی ہیرو ثابت ہو۔ ایک ہی جنگ کی مختلف کہانیاں ہمارے لیے نئی نہیں ہیں۔ حال ہی میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کے دوران بھی ہم نے یہی صورتِ حال دیکھی۔ دونوں ممالک کا میڈیا دیکھ لیجیے، دونوں کے اپنے اپنے ہیروز موجود ہیں اور دونوں اپنی اپنی کہانی بیان کر رہے ہیں۔

لہٰذا بنیادی طور پر ہم جس معاملے پر گفتگو کر رہے ہیں، وہ کہانی ہے۔ فلم، تھیٹر اور ڈراما اس کہانی کو بیان کرنے کے ذرائع ہیں۔ فلم، تھیٹر اور ڈراما ہمیں صرف تفریح نہیں دیتے۔ یہ ہمیں کہانیاں دیتے ہیں اور اصل سوال یہ ہے کہ کس کی کہانی بیان کی گئی؟ کس کو بولنے کا موقع دیا گیا؟ کس کو ہیرو بنایا گیا؟ کس کو ولن بنا کر پیش کیا گیا؟ اور کس کی کہانی کو بالکل شامل ہی نہیں کیا گیا؟

یہیں سے میری گفتگو آزادیِ اظہار تک پہنچتی ہے۔ میرے نزدیک معاشرے میں کسی خیال کو صرف اس بنیاد پر خاموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہ ہمیں غلط محسوس ہوتا ہے۔ کوئی خیال واقعی غلط ہوسکتا ہے، انتہائی غلط بھی ہوسکتا ہے اور ہمیں اس سے شدید اختلاف بھی ہوسکتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس خیال کے مناسب، پُرامن اور قانونی اظہار کی گنجائش ہونی چاہیے؟ میرا جواب ہے، ضرور ہونی چاہیے۔

کیوں کہ کسی خیال کو خاموش کرنے کے بجائے اسے دلیل سے شکست دینے کی کوشش علم پیدا کرتی ہے۔ کسی فلم پر پابندی عائد کرنا ایک طرح کا اظہارِ قوت ہے، کسی ڈرامے کو بند کرنا بھی اظہارِ قوت ہے، لیکن کسی خیال کو دلیل کے ذریعے غلط ثابت کرنے کی کوشش علم اور فکری مکالمے کو جنم دیتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جان ملٹن کے آزادیِ اظہار سے متعلق نظریات ہمارے لیے اہم ہو جاتے ہیں۔ جان ملٹن نے سنسر شپ کے حوالے سے ایک بنیادی سوال اٹھایا تھا کہ جو لوگ کسی مواد کو دیکھ کر خود خراب نہیں ہوئے، وہ یہ فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں کہ عوام اس مواد کو دیکھ کر لازماً خراب ہو جائیں گے؟

کیا کسی تخلیق کار کے لیے یہ ضروری ہونا چاہیے کہ وہ اپنے خیالات یا تخلیق کو عوام تک پہنچانے سے پہلے کسی سرکاری اہلکار کے سامنے پیش کرے اور اس کی منظوری حاصل کرے؟ یہ سوال صرف فلم، ڈراما یا تھیٹر کا نہیں، بلکہ آزادیِ اظہار، تخلیقی آزادی اور معاشرے میں فکری تنوع کا سوال ہے۔ میں اپنی گفتگو کو اسی بنیادی سوال پر چھوڑنا چاہوں گا کہ کیا کسی بھی کہانی کو عوام تک پہنچنے سے پہلے روکنے کا اختیار کسی فرد، کسی ریاست، کسی نظریے یا کسی مذہبی اتھارٹی کو دیا جا سکتا ہے؟ کیوں کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب طاقتور لوگوں کو کسی خیال یا کہانی کو روکنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے تو بالآخر یہی اختیار اپنے مفادات کے لیے استعمال ہونے لگتا ہے۔

اسی لیے میں فلم، ڈراما اور تھیٹر کے مقدمے کو کہانی کے مقدمے میں تبدیل کر کے آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ خود جج بنیں اور فیصلہ کریں کہ کون سی کہانی درست ہے، کس کہانی میں جھول ہے، کس کہانی میں حقیقت موجود ہے اور کس میں تعصب شامل ہے۔ کہانی کے عوام تک پہنچنے کی تمام رکاوٹیں اگر فکری مکالمے کے بجائے طاقت اور پابندی پر مبنی ہوں تو وہ خود ایک مسئلہ بن جاتی ہیں۔ شاید ہمارے فلم، ڈراما اور تھیٹر کی موجودہ صورتِ حال کو بھی ہمیں گزشتہ کئی دہائیوں کے قوانین، پابندیوں اور تجربات کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

سوال و جواب کی نشست:

سوال: کیا بدلتے ہوئے معاشرے کے ساتھ ہماری سوچ اور تفریح کو دیکھنے کا انداز بھی تبدیل ہوسکتا ہے؟ کیا تفریحی ذرائع، خصوصاً فلم، ڈراما اور دیگر میڈیا مواد کو معاشرے کی اصلاح اور مثبت تبدیلی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے؟

جواب: فلم، ڈراما اور دیگر مواد کو مکمل طور پر اچھا یا برا قرار دینا درست نہیں۔ ان کا اثر اس بات پر منحصر ہے کہ انہیں کس مقصد اور کس انداز میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جس طرح ایک چھری سبزی کاٹنے کے لیے استعمال ہو تو اس کا استعمال مفید ہے، لیکن کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے استعمال کی جائے تو نقصان دہ ہے، اسی طرح میڈیا بھی اپنے استعمال کے اعتبار سے مثبت یا منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ اگر ڈراما اور فلم اچھے موضوعات اور مثبت پیغام کے ساتھ بنائے جائیں تو وہ معاشرے پر یقیناً اچھا اثر ڈال سکتے ہیں۔

سوال: جب موجودہ دور میں بچے اور نوجوان مختلف عالمی میڈیا پلیٹ فارمز اور غیر ملکی مواد تک آسانی سے رسائی رکھتے ہیں تو کیا ہمیں اپنی ثقافت اور اقدار کے مطابق متبادل پلیٹ فارمز اور مواد تیار نہیں کرنا چاہیے؟

جواب: آج میڈیا کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے اور صرف روایتی ٹیلی وژن یا سینما تک محدود نہیں رہا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کے لیے ایسا معیاری اور مثبت مواد تخلیق کیا جائے جو ان کی عمر، ذہنی نشوونما، ثقافت اور معاشرتی اقدار سے ہم آہنگ ہو۔ محض پابندی یا مواد روکنے کے بجائے معیاری متبادل فراہم کرنا زیادہ مؤثر راستہ ہے۔

سوال: اگر سنسر شپ عوامی اخلاقیات کے تحفظ کے لیے ہے تو پھر بعض ایسے مواد کو کیوں نہیں روکا جاتا جو اخلاقی اقدار کے منافی سمجھا جاتا ہے؟ اور اگر مقصد کسی ادارے کی ساکھ کا تحفظ ہے تو پھر سنسر شپ کے اصول کیا ہونے چاہئیں؟

جواب: یہ بنیادی سوال ہے کہ سنسر شپ کا مقصد دراصل کیا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ پابندی کا معیار واضح، یکساں اور اصولوں پر مبنی ہے یا نہیں۔ میڈیا کے حوالے سے بنائے گئے قوانین اور اداروں کی کارکردگی کا جائزہ بھی اسی تناظر میں لینا چاہیے کہ وہ معاشرتی اور ثقافتی اقدار کے تحفظ کے لیے کام کر رہے ہیں یا محض ادارہ جاتی اور سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے۔

سوال: فنکارانہ آزادی اور معاشرتی ذمے داری کے درمیان حد کہاں قائم کی جانی چاہیے؟ اگر کوئی ڈراما ہماری ثقافتی، مذہبی یا روایتی اقدار کو چیلنج کرتا ہو تو اسے کس حد تک آزادی حاصل ہونی چاہیے؟

جواب: اختلافِ رائے اور مختلف خیالات کا اظہار ایک زندہ معاشرے کی ضرورت ہے۔ کسی خیال کو صرف اس لیے خاموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہ ہمیں پسند نہیں یا ہم اسے غلط سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی خیال غلط ہے تو اسے دلیل اور مکالمے کے ذریعے رد کیا جا سکتا ہے۔ البتہ آزادیِ اظہار کے ساتھ ذمے داری اور قانونی حدود کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

سوال: بچوں کے لیے ایسا مقامی اور معیاری مواد کیوں تیار نہیں کیا جا رہا جو انہیں اپنی زبان، ثقافت اور اقدار سے جوڑ سکے؟ کیا کارٹونز اور دیگر بچوں کے پروگراموں کو اصلاح اور تربیت کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے؟

جواب: بچوں کے لیے معیاری مواد کی تیاری ایک اہم ضرورت ہے۔ دنیا کے کئی ممالک نے اپنی ثقافت اور اقدار کے مطابق بچوں کے لیے کارٹونز، پروگرامز اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز تیار کیے ہیں۔ پاکستان میں بھی اس سمت میں سنجیدہ اور منظم کوشش کی ضرورت ہے، تاکہ نئی نسل کو ایسا مواد میسر ہو جو تفریح کے ساتھ ساتھ علم، تربیت اور مثبت اقدار بھی فراہم کرے۔

سوال: پاکستان کے ڈراموں اور فلموں میں زیادہ تر گھریلو مسائل اور محبت کی کہانیاں دکھائی جاتی ہیں۔ غربت، معاشی مشکلات اور نچلے و متوسط طبقے کے مسائل جیسے بڑے معاشرتی موضوعات کو زیادہ نمایاں کیوں نہیں کیا جاتا؟

جواب: میڈیا کو معاشرے کے حقیقی مسائل کی عکاسی بھی کرنی چاہیے۔ غربت، تعلیم، صحت، روزگار، طبقاتی فرق اور معاشی مشکلات جیسے موضوعات ہماری اجتماعی زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ ایسے موضوعات کو مؤثر کہانیوں کے ذریعے سامنے لانا میڈیا کے مثبت کردار کو مضبوط کر سکتا ہے اور ناظرین میں شعور بھی پیدا کر سکتا ہے۔

سوال: جب ہم اپنی ثقافت کو فروغ دینے کی بات کرتے ہیں تو آخر ہم کس ثقافت کی بات کر رہے ہیں؟ ہماری ترجیحات کیا ہیں اور ہمارے اصل سماجی مسائل کون سے ہیں؟

جواب: یہ بنیادی نوعیت کا سوال ہے کہ ہم اپنی ثقافتی شناخت اور سماجی ترجیحات کا تعین کیسے کرتے ہیں۔ محض نعروں کے بجائے ہمیں اپنے معاشرے کے حقیقی مسائل، اقدار اور ضروریات کو سمجھنا ہوگا۔ ہماری تعلیمات ہمیں اعتدال، احتساب، برداشت اور سوال کرنے کی آزادی کا

درس دیتی ہیں، اس لیے ان اصولوں کو عملی زندگی میں بھی اہمیت دینا ضروری ہے۔

سوال: کیا میڈیا کو محض ایک خطرناک اور بے قابو طاقت سمجھنے کے بجائے اسے موجودہ عالمی میڈیا نظام کے تناظر میں سمجھنے کی ضرورت نہیں؟

جواب: آج کا میڈیا نظام 1970ء، 1980ء یا 1990ء کے میڈیا نظام سے بالکل مختلف ہے۔ آج پاکستانی ناظرین عالمی میڈیا کے وسیع نظام سے براہِ راست منسلک ہیں۔ اس لیے موجودہ میڈیا کو ماضی کے پیمانوں سے پرکھنے کے بجائے موجودہ عالمی میڈیا کے تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پاکستانی میڈیا میں ایسے متعدد ڈرامے بھی سامنے آئے ہیں جنھوں نے ہمارے معاشرے کے اہم اور حساس مسائل کو موضوع بنایا اور عالمی سطح پر پذیرائی حاصل کی۔ اُڈاری، باغی اور چیخ جیسے ڈرامے اس بات کی مثال ہیں کہ میڈیا معاشرتی مسائل کو اجاگر کرنے اور عوامی گفتگو کو آگے بڑھانے کا مؤثر ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

سوال: کیا ہر مسئلے کا حل سنسرشپ اور پابندی ہے؟

جواب: ہر مسئلے کا حل پابندی نہیں۔ آج کے دور میں کسی ریاست یا ادارے کے لیے میڈیا کو مکمل طور پر ماضی کے انداز میں کنٹرول کرنا ممکن نہیں۔ پابندی کے بجائے میڈیا کی سمجھ بوجھ، تنقیدی شعور اور ذمے دارانہ استعمال کو فروغ دینا زیادہ مؤثر راستہ ہے۔ اس سلسلے میں ''میڈیا ڈائٹ'' کا تصور اہم ہے۔ جس طرح ہم زندگی کے مختلف مراحل میں ایک ہی قسم کی غذا استعمال نہیں کرتے، اسی طرح ہر عمر میں ایک ہی نوعیت کا میڈیا مواد بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔ ہر فرد کو اپنی میڈیا ڈائٹ کے بارے میں خود باشعور ہونا چاہیے اور یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کون سا مواد اس کے لیے مفید، تعمیری اور پیداواری ہے۔ میڈیا سے خوفزدہ ہونے کے بجائے اسے سمجھنا، پرکھنا اور شعوری طور پر استعمال کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم اپنی میڈیا ڈائٹ کے خود ذمے دار بن جائیں تو یہی میڈیا ہمارے لیے کمزوری کے بجائے علم، شعور اور مثبت تبدیلی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

موضوع کا تفصیلی جائزہ اور تبادلۂ خیال کے لیے اسپیکر نے فاضل اراکین شوریٰ کو اظہارِ خیال کی دعوت دی ان کی بحث اور تبادلۂ خیال سے مندرجہ ذیل نکات مرتب ہوئے ہیں۔

☆ فلم، ڈراما اور تھیٹر معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں، اس لیے ان ذرائع کو مثبت اور تعمیری مقاصد کے لیے مؤثر انداز میں استعمال کیا جائے۔

☆ ٹیلی وژن، فلم، تھیٹر اور ڈیجیٹل میڈیا کے مواد میں معاشرتی اقدار، تہذیبی شناخت اور اخلاقی ذمے داری کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔

☆ نوجوانوں اور بچوں کو نامناسب اور نقصان دہ مواد سے محفوظ رکھنے کے لیے والدین، تعلیمی اداروں، میڈیا اور ریاست کو مشترکہ ذمے داری ادا کرنا ہوگی۔

☆ سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے بڑھتے ہوئے استعمال کے پیشِ نظر بچوں اور نوجوانوں میں میڈیا لٹریسی کو فروغ دیا جائے، تاکہ وہ مواد کو سمجھنے، پرکھنے اور ذمے داری کے ساتھ استعمال کرنے کی صلاحیت حاصل کرسکیں۔

☆ میڈیا کے مسائل کی تمام تر ذمے داری صرف میڈیا اداروں پر عائد کرنے کے بجائے قانون سازی، ریاستی پالیسیوں اور ریگولیٹری نظام کا بھی جائزہ لیا جائے۔

☆ میڈیا سے متعلق قوانین پر مؤثر اور منصفانہ عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے اور صحافیوں و میڈیا کارکنوں کے حقوق اور حالاتِ کار کی بہتری پر بھی توجہ دی جائے۔

☆ سنسرشپ اور پابندیوں کے بجائے ذمے دارانہ آزادیِ اظہار، دلیل، مکالمے اور فکری اختلاف کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

☆ مختلف نقطہ نظر اور مختلف کہانیوں کو سامنے آنے کا موقع دیا جائے، تاکہ معاشرے میں فکری تنوع اور برداشت کو فروغ ملے۔

☆ فلم، ڈراما اور تھیٹر کو محض تفریح کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے معاشرتی شعور، قومی یکجہتی، مثبت اقدار اور انسانی مسائل کے اجاگر کرنے کے مؤثر ذرائع کے طور پر بھی استعمال کیا جائے۔

☆ تخلیق کاروں کو آزادیِ اظہار کے ساتھ اپنی سماجی ذمے داری کا بھی احساس ہونا چاہیے، جب کہ ناظرین کو بھی ہر پیش کردہ مواد کو تنقیدی نظر سے دیکھنے اور اس کے اثرات کو سمجھنے کی تربیت دی جانی چاہیے۔

☆ ریاست، میڈیا، تعلیمی اداروں، والدین اور سول سوسائٹی کے درمیان باہمی تعاون کے ذریعے ایسا میڈیا ماحول تشکیل دیا جائے جو آزادیِ اظہار اور معاشرتی ذمے داری کے درمیان متوازن

راستہ اختیار کرے۔

☆ نوجوانوں کو میڈیا اور فکری مباحث کا فعال حصہ بنایا جائے، تاکہ وہ نہ صرف موجودہ میڈیا منظرنامے کو سمجھ سکیں، بلکہ مستقبل کے ذمے دار تخلیق کار، ناظرین اور شہری بھی بن سکیں۔

☆ ہمیں اپنی فلموں، ڈراموں اور تھیٹر میں مثبت سماجی اقدار اور اچھے اخلاق کو نمایاں کرنا ہوگا۔

☆ تخلیقی مواد میں معاشرے کے حقیقی مسائل، خصوصاً غربت، استحصال، جدوجہد اور سماجی ناانصافی کو مؤثر انداز میں پیش کیا جائے۔

☆ فلم اور ڈراما محض تفریح تک محدود نہ ہوں، بلکہ لوگوں کو سوچنے اور اپنے رویوں پر غور کرنے کی ترغیب دیں۔

☆ اچھے اور مثبت کرداروں کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ نوجوان اور بچے ان سے متاثر ہو کر اچھے کردار کی طرف راغب ہوں۔

☆ ہمیں اپنی سماجی اور اخلاقی اقدار کو فلم اور ڈرامے کے ذریعے نئی نسل تک منتقل کرنا چاہیے۔

☆ دنیا کے کامیاب فلمی رجحانات سے سیکھتے ہوئے اپنی فلمی صنعت میں سرمایہ کاری، معیار اور تکنیکی صلاحیت کو بہتر بنانا ہوگا۔

☆ پاکستانی ڈرامے کی مضبوط روایت کو بنیاد بنا کر فلم کے میدان میں بھی معیاری اور بامقصد کام کو فروغ دینا چاہیے۔

☆ فلم، تھیٹر اور ٹیلی وژن کی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے مثبت سوچ، بہتر اخلاق اور ایک بہتر معاشرے کا تصور نئی نسل تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

☆ ڈراموں میں طبقاتی فرق کو نفرت کے بجائے سماجی شعور اور مکالمے کے فروغ کے لیے استعمال کیا جائے۔

☆ شاہانہ طرزِ زندگی کے ساتھ عام اور محروم طبقے کے حقیقی مسائل بھی نمایاں کیے جائیں۔

☆ ڈراموں میں مقامی معاشرت، تعلیم، غربت، یتیم بچوں اور سماجی مسائل کو زیادہ جگہ دی جائے۔

☆ میڈیا کو متوازن، حقائق پر مبنی اور ذمے دارانہ اظہارِ رائے کا موقع دیا جائے۔

☆ روایتی میڈیا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز دونوں میں مختلف نقطۂ نظر اور صحت مند مکالمے کی گنجائش پیدا کی جائے۔

☆ اسلامی اصولوں کو صرف بیان کرنے کے بجائے عملی زندگی میں نافذ کیا جائے۔

☆ گھروں، تعلیمی اداروں اور معاشرے میں سچائی اور دیانت داری کی تربیت کو فروغ دیا جائے۔

☆ سیاسی، سماجی اور مذہبی قیادت اپنے کردار اور عمل سے مثال قائم کرے۔

☆ جھوٹ، دھوکا دہی اور ملاوٹ جیسے روزمرہ کے رویوں کے خلاف اخلاقی اور سماجی شعور پیدا کیا جائے۔

☆ معاشرتی اصلاح کا آغاز فرد اور گھر سے کیا جائے اور اسے حکومتی سطح تک لے جایا جائے۔

☆ ایسے فورمز کو عملی اقدامات اور قومی کردار سازی کی بنیاد بنایا جائے۔

☆ نئی نسل کو سوشل میڈیا کے ذمے دارانہ اور مثبت استعمال کی تربیت دی جائے۔

☆ مختلف ذرائع سے آنے والی معلومات کو تنقیدی اور شعوری انداز میں پرکھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔

☆ معاشرتی اصلاح کے لیے صرف زبردستی کے اقدامات کے بجائے Self Corrective Mechanisms کو فروغ دیا جائے۔

☆ نوجوانوں کو اپنے معاشرے کے مسائل پر آواز اٹھانے اور مثبت مکالمے میں حصہ لینے کے مواقع دیے جائیں۔

☆ سوشل میڈیا کو محض تفریح کے بجائے آگاہی، احتساب اور معاشرتی اصلاح کے مؤثر ذریعہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔

☆ ایک ہی بیانیے کے بجائے مختلف نقطۂ نظر سننے اور سمجھنے کی گنجائش پیدا کی جائے۔

☆ ایسی فلموں اور ڈراموں کو فروغ دیا جائے جو خاندان کے ساتھ بیٹھ کر دیکھے جاسکیں۔

☆ فلم اور تھیٹر میں تشدد، فحاشی اور غیر اخلاقی مواد کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

☆ سنسر بورڈ اور متعلقہ ادارے اخلاقی، ثقافتی اور مذہبی اقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے مؤثر نگرانی کریں۔

☆ عوامی مقبولیت کے ساتھ معاشرتی اثرات کو بھی مواد کی کامیابی کا پیمانہ بنایا جائے۔

☆ مثبت، تعمیری اور اخلاقی مواد کو زیادہ مواقع اور پلیٹ فارم فراہم کیے جائیں۔

☆ فلم، ڈراما اور تھیٹر کو معاشرے میں مثبت سوچ اور اچھی اقدار کے فروغ کے لیے استعمال کیا جائے۔

☆ نئی نسل کو میڈیا اور ڈیجیٹل لٹریسی کی تربیت دی جائے۔

☆ نوجوانوں کو مختلف ذرائع سے ملنے والی معلومات کی تصدیق اور تنقیدی تجزیے کی عادت ڈالی جائے۔

☆فلم، ڈراما اور سوشل میڈیا کے سیاسی، معاشرتی اور تزویراتی اثرات کو سمجھنے کے لیے آگاہی پیدا کی جائے۔

☆مصنوعی ذہانت اور سوشل میڈیا کے الگورتھمز اور ان کے اثرات کے بارے میں عوام کو آگاہ کیا جائے۔

☆جھوٹی خبروں، افواہوں اور منفی پروپیگنڈے کے مقابلے کے لیے ذمے دارانہ معلوماتی نظام کو مضبوط بنایا جائے۔

☆نوجوانوں کو یہ شعور دیا جائے کہ کیا دیکھنا ہے، کس پر یقین کرنا ہے اور کس چیز کو آگے پھیلانا ہے۔اس کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا ضروری ہے۔

☆سب سے پہلے یہ واضح کیا جائے کہ ہم کس قسم کا معاشرہ تشکیل دینا چاہتے ہیں۔

☆میڈیا میں آزادی اظہار اور تخلیقی صلاحیت کو برقرار رکھا جائے۔

☆ڈراموں میں خواتین کو محض کردار یا شے کے بجائے بااختیار اور سوچنے والی شخصیت کے طور پر پیش کیا جائے۔

☆میڈیا کو مخصوص بیانیے مسلط کرنے کے بجائے مختلف نقطۂ نظر اور صحت مند مکالمے کے لیے استعمال کیا جائے۔

☆نوجوانوں کو صرف معلومات اور رٹے کے بجائے تنقیدی اور آزادانہ سوچ کی تربیت دی جائے۔

☆تعلیمی اداروں کا مقصد صرف تعلیم دینا نہیں، بلکہ اچھے انسان اور باشعور شہری تیار کرنا بھی ہو۔

☆استاد طلبہ کو مختلف زاوی نظر، علم اور سوال کرنے کی صلاحیت فراہم کرے، تاکہ وہ اپنی سوچ کے ساتھ معاشرے میں کردار ادا کر سکیں۔

ہمدرد شوریٰ (پشاور) اجلاس

ہمدرد شوریٰ (پشاور) کے اجلاس میں پروفیسر ڈاکٹر فخر الاسلام (اسپیکر)، محترم سید مشتاق حسین شاہ بخاری (ڈپٹی اسپیکر)، محترم قاری شاہد اعظم الاذہری، محترم پروفیسر حامد محمود، محترم میاں انور سید، محترمہ ڈاکٹر سیما شفیع مبصرین کرام میں محترم ڈاکٹر خادم ابراہیم، محترم ڈاکٹر راج آفریدی، محترمہ فاطمہ افضال، محترمہ سیدہ فاطمہ بتول گیلانی، محترم سہراب علی اور ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان (پشاور) سے محترم محمد خالد اور محترم عابد شاہ نے شرکت کی۔ محترم مشتاق شباب (ڈرامہ نگار، شاعر، ادیب، محقق، مصنف، کالم نگار، تجزیہ کار اور سابق اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان پشاور) کو بطور مہمان مقرر مدعو کیا گیا۔

محترم پروفیسر ڈاکٹر فخر الاسلام نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ فلم، تھیٹر اور ڈرامے کا ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ فلم اور ڈراما قومی بیانیہ تشکیل دینے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں، تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ ان ذرائع کو سوچ سمجھ کر اور ذمے داری کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ڈراموں کے صرف منفی ہی نہیں، بلکہ مثبت اثرات بھی معاشرے پر مرتب ہو رہے ہیں۔ اچھے کردار اور مثبت رویے ہوں یا برے کردار اور منفی رویے، ڈراما دونوں کو معاشرے کے سامنے پیش کرتا ہے، اس لیے اسے اصلاحِ معاشرہ کے مؤثر ذریعے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایسے کئی ڈرامے بھی سامنے آئے ہیں جنہوں نے معاشرے پر مثبت اثرات مرتب کیے اور لوگوں کی سوچ و فکر کو متاثر کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ فلم، تھیٹر اور ڈرامے کے میڈیا کو معاشرتی اصلاح، اخلاقی تربیت اور مثبت اقدار کے فروغ کے لیے مؤثر انداز میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ترک ڈراما سیریلز کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان میں سبق آموز موضوعات کے ساتھ نماز، اللہ کا خوف اور تربیت پر مبنی موضوعات بھی اجاگر کیے جاتے ہیں، جو ناظرین کی فکری اور اخلاقی تربیت میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

مہمان مقرر محترم مشتاق شباب صاحب نے اپنے کلیدی خطاب میں مذکورہ موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ڈراما انسانی تہذیب کے ارتقائی سفر کا ایک اہم حصہ ہے۔ کسی بھی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے تاریخی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے، اس لیے ڈرامے کی معاشرتی اہمیت کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی ابتدائی شکلوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عام طور پر ڈرامے کی باقاعدہ تاریخ تقریباً دو ہزار سال پرانی قرار دی جاتی ہے، تاہم اس کی ابتدائی صورت اس سے کہیں قدیم دکھائی دیتی ہے۔ جب انسان غاروں اور بیابانوں کی انفرادی زندگی سے نکل کر اجتماعی زندگی کی طرف بڑھا تو شکار میں کامیابی کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے اشاروں، حرکات و سکنات اور مختلف

آوازوں کے ذریعے اپنے جذبات اور واقعات بیان کرتا تھا۔ یہی انداز آگے چل کر اداکاری کی ابتدائی صورتوں میں تبدیل ہوا۔ کھیتی باڑی کے آغاز کے بعد فصل کی خوشی میں اجتماعی رقص اور مختلف رسوم نے بھی اس ڈرامائی کیفیت کو مزید تقویت دی۔ انسانی تہذیب کے ارتقاء کے ساتھ قدیم یونان، مصر اور دیگر معاشروں میں ڈرامے نے باقاعدہ فنی شکل اختیار کی اور اسٹیج ڈرامے کی بنیاد پڑی۔ رفتہ رفتہ کردار، مکالمہ، عمل اور اظہار کے اصول مرتب ہوئے۔ فنی اعتبار سے ڈرامہ دراصل مجسم عمل ہے، جسے انگریزی کے الفاظ ''To Act'' یعنی ''کر کے دکھانا'' سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں ٹیلی ویژن کے آغاز کے ساتھ ڈرامے نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ ابتدائی پی ٹی وی ڈراموں میں سادگی، معاشرتی روایات، تہذیب وتمدن، تاریخی پس منظر اور مذہبی اقدار کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ریڈیو کے کئی مقبول ڈراموں کو ٹی وی کے لیے ڈھالا گیا، بعدازاں عالمی سطح کی تکنیک اور تربیت نے پاکستانی ڈرامے کو مزید ترقی دی۔ اس دور میں معیاری تحریر، مضبوط کردار اور معاشرتی مسائل کو اجاگر کرنے والے ڈرامے ناظرین میں خاص مقبول ہوئے۔ نجی ٹی وی چینلز کے وسیع پیمانے پر آغاز کے بعد ڈرامے میں مسابقت بڑھی اور موضوعات میں بھی نمایاں تبدیلی آئی۔ بہت سے معیاری ڈرامے سامنے آئے، لیکن بعض ڈراموں میں غیر ضروری بے باکی، نامناسب مکالموں، مصنوعی طرزِ زندگی اور خاندانی رشتوں کو غیر فطری انداز میں پیش کرنے کے رجحانات نے تشویش کو جنم دیا۔ ڈراما چوں کہ معاشرے کی سوچ، رویوں اور طرزِ زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے رشتوں، لباس، زبان اور کرداروں کی پیشکش بھی ناظرین خصوصا نوجوان نسل کے ذہنوں پر اثر ڈال سکتی ہے۔ تاہم فلم، تھیٹر اور ڈرامے کے صرف منفی پہلوؤں کو دیکھنا بھی درست نہیں۔ دنیا بھر میں ان ذرائع کو تعلیم، شعور، اصلاح اور کردار سازی کے لیے استعمال کیا گیا۔ پاکستان میں ریڈیو نے عوامی آگاہی اور معاشرتی اصلاح میں اہم کردار ادا کیا، جب کہ ریڈیو پاکستان پشاور سے ہندکو میں نشر ہونے والا ''قہوہ خانہ'' بھی ایک یادگار مثال ہے۔ اسی طرح پی ٹی وی کے متعدد مزاحیہ اور اصلاحی پروگراموں میں تفریح کے ساتھ معاشرتی اصلاح کا پہلو نمایاں رہا۔ جب کہ موجودہ صورتحال پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ نجی ٹی وی چینلز پر نشر ہونے والے ڈراموں کو بھی مؤثر پیشگی جانچ کے نظام سے گزارا جائے۔ اس مقصد کے لیے متعلقہ شعبوں کے ماہرین پر مشتمل ایک سنسر شپ یا جائزہ بورڈ قائم کیا جا سکتا ہے، جو ڈرامے کے اسکرپٹ سے لے کر ریکارڈنگ مکمل ہونے کے بعد پری ویو تک تمام مراحل کا جائزہ لے۔ اس عمل کا مقصد غیر مناسب یا معاشرتی و تہذیبی اقدار سے متصادم مواد کو ناظرین تک پہنچنے سے پہلے ہی مناسب انداز میں درست کرنا ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں پیمرا کے تحت ایک بااختیار اور مؤثر کمیٹی کا قیام بھی زیرِ غور لایا جا سکتا ہے، تاکہ نجی ٹی وی ڈراموں میں غیر ضروری بے باکی، نامناسب مکالموں اور معاشرتی اقدار سے متصادم مواد کی روک تھام ممکن ہو اور بعد ازاں ناظرین کے اعتراضات یا شکایات کی نوبت نہ آئے۔ جس طرح فلموں کے لیے سنسر بورڈ موجود ہے، اسی طرح ٹی وی ڈراموں اور نشریات کے لیے بھی مؤثر پیشگی نگرانی کا نظام معاشرتی اور تہذیبی اقدار کے تحفظ میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر خادم ابراہیم کا کہنا تھا کہ ہم جب پی ٹی وی کے ڈراموں، فلموں یا اسٹیج ڈراموں کی بات کرتے ہیں تو اکثر سارا قصور ڈراما بنانے والوں پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض ڈراموں میں عریانیت، بے حیائی اور ایسے مکالمے بھی شامل ہوتے ہیں جو نشر نہیں ہونے چاہییں۔ اس کے برعکس اچھے، معیاری اور سبق آموز ڈرامے معاشرے پر مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں اور لوگوں کی سوچ وفکر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مختلف ٹی وی چینلز کی بھرمار نے ڈراموں کو کسی حد تک بے لگام کر دیا ہے۔ فلم کے لیے تو سنسر شپ کا باقاعدہ نظام موجود ہے، لیکن موجودہ دور میں ٹی وی ڈراموں کے لیے ایسا مؤثر پیشگی سنسر شپ نظام موجود نہیں، جس کے باعث بعض اوقات ایسے مکالمے اور مناظر بھی نشر ہو جاتے ہیں جو معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے منافی ہوتے ہیں۔ جب ان پر سوشل میڈیا میں شدید ردعمل سامنے آتا ہے تو متعلقہ چینلز کو احساس ہوتا ہے کہ ان سے غلطی ہوئی ہے اور پھر معذرت کی جاتی ہے۔ اس

صورتِ حال میں صرف ڈراما سازوں یا ٹی وی چینلز کو قصوروار ٹھہرانا کافی نہیں، بلکہ معاشرے اور ناظرین کی بھی ذمے داری ہے کہ وہ نامناسب مواد کے خلاف آواز اٹھائیں۔ میری رائے میں ٹی وی ڈراموں کے لیے بھی ایک مؤثر اور بااختیار ریگولیٹری ادارہ قائم ہونا چاہیے، جو کسی بھی ڈرامے کو نشر ہونے سے قبل اس کے اسکرپٹ اور مکمل شدہ پروگرام کا جائزہ لے۔ اس مقصد کے لیے متعلقہ شعبوں کے ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جاسکتی ہے، جو یہ دیکھے کہ ڈرامے میں شامل مکالمے، مناظر اور موضوعات معاشرتی، اخلاقی اور ثقافتی اقدار سے ہم آہنگ ہیں یا نہیں۔ بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ جو کچھ ٹی وی پر نشر کیا جائے، اسے ہم اپنے بہن بھائیوں، بچوں اور والدین کے ساتھ بیٹھ کر اطمینان سے دیکھ سکیں۔

ڈاکٹر راج آفریدی صاحب نے اظہارِ خیال کیا کہ ڈرامہ، تھیٹر اور فلم ابلاغ کے نہایت مؤثر ذرائع ہیں، لیکن دورِ جدید کے بعض ڈراموں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات کسی خاص ایجنڈے یا پالیسی کے تحت منتخب کیے جارہے ہیں۔ بہت سے پاکستانی ڈراموں کے موضوعات اور بعض مناظر ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم فیملی کے ساتھ بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتے۔ اس صورتِ حال کے معاشرے پر منفی اثرات بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ مقدس رشتوں کی پامالی، خاندانی نظام میں کمزوری اور طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح جیسے مسائل کے حوالے سے بھی ڈراموں کے اثرات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم ماضی کے ڈراموں، خصوصاً پی ٹی وی پشاور سینٹر کے ڈراموں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں ڈراما محض تفریح کا ذریعہ نہیں تھا، بلکہ معاشرتی اصلاح اور عوامی شعور بیدار کرنے کا ایک مؤثر وسیلہ بھی تھا۔ ایسے ڈرامے پیش کیے گئے جنہوں نے نہ صرف سماجی مسائل کی نشاندہی کی، بلکہ حکومت اور معاشرے کو ان کے حل کی طرف بھی متوجہ کیا۔ فضل حسین سلیم کا 1983ء میں پی ٹی وی پشاور سینٹر سے ٹیلی کاسٹ ہونے والا ڈراما ''سورج کے ساتھی'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس ڈرامے میں ڈیرہ اسماعیل خان میں انسانی رکشہ اور انسانی سائیکل کے مسئلے کو موضوع بنایا گیا۔ ڈرامے کے ذریعے اس مسئلے کی نشاندہی کی گئی اور حکومت کو یہ پیغام دیا گیا کہ انسانوں سے اس طرح مشقت لینا مناسب نہیں۔ اسی طرح مشتاق شباب کا 1983ء میں پی ٹی وی پشاور سینٹر سے نشر ہونے والا ڈراما ''کانچ اور پتھر'' بھی اپنے اندر ایک مضبوط اصلاحی پیغام رکھتا تھا۔ اس میں یہ سبق دیا گیا کہ ہمیں غلط کو غلط کہنا چاہیے اور معاشرے میں قانون کی بالادستی قائم ہونی چاہیے۔ ''شکار'' کے عنوان سے پیش کیے جانے والے ڈرامے میں بھی شکار کی مذمت کی گئی اور ناظرین کو ایک مثبت سماجی پیغام دیا گیا۔ 1984ء میں ٹیلی کاسٹ ہونے والا ڈراما ''احساس'' بھی اپنے موضوع اور پیغام کے اعتبار سے قابلِ ذکر تھا۔ اسی طرح سعد اللہ جان برق کے مزاحیہ ڈرامے ''یونیفارم'' نے بھی ناظرین کو تفریح کے ساتھ ساتھ ایک بامقصد پیغام دیا۔ ''فاصلوں کے درمیان'' بھی ایک مقبول پاکستانی ٹیلی ویژن ڈراما ہے، جس میں محبت، احساسات اور خلوص کے جذبات کی کشمکش کو منفرد انداز میں پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر ہمایوں ہما کا ڈراما ''جھوٹ کی عادت نہیں مجھے'' بھی معاشرتی مسائل کو موضوع بناتا ہے اور ناظرین کو اپنے رویوں پر غور کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آج کا ڈراما نگار ایسے موضوعات کا انتخاب کیوں نہیں کرتا؟ ہمارے معاشرے میں بے شمار مسائل موجود ہیں، خاندانی نظام، تعلیم، غربت، قانون کی بالادستی، منشیات، بچوں کی تربیت، بزرگوں کا احترام، ماحولیاتی مسائل اور سماجی ذمے داری جیسے موضوعات ڈرامے کے ذریعے مؤثر انداز میں عوام تک پہنچائے جا سکتے ہیں۔ آج کل کورین اور ترکیہ کے ڈرامے بھی پاکستان میں بڑی تعداد میں دیکھے جا رہے ہیں۔ ان ڈراموں کی مقبولیت کی ایک وجہ ان کی کہانی، کرداروں کی مضبوطی اور جذباتی کشمکش ہے۔ ہمیں بھی اپنے ڈرامے کی بنیادی قوت یعنی ''اچھی کہانی، مضبوط کردار اور بامقصد پیغام'' کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا۔ ڈراما معاشرے کا آئینہ بھی ہوتا ہے اور معاشرے کی تشکیل کا ذریعہ بھی۔ اگر اسے ذمے داری کے ساتھ استعمال کیا جائے تو یہ بگاڑ پیدا کرنے کے بجائے معاشرتی اصلاح، اخلاقی تربیت اور قومی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آج کے

ڈراما نگار اور پروڈیوسر بھی ماضی کے ان بامقصد ڈراموں سے رہنمائی لیں اور ایسے موضوعات کو ترجیح دیں جنہیں پورا خاندان مل بیٹھ کر دیکھ سکے اور جن سے معاشرے کو کوئی مثبت پیغام ملے۔

مشتاق حسین بخاری صاحب نے فرمایا کہ بچوں اور نوجوانوں پر موبائل فون اور سوشل میڈیا کے اثرات بھی ایک اہم پہلو ہے۔ اگرچہ عمر کے لحاظ سے بچے اور نوجوان سوشل میڈیا اور موبائل کے ذریعے بہت کچھ سیکھ رہے ہیں اور اس کے مثبت اثرات بھی موجود ہیں، تاہم اس کے منفی اثرات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ بچے اور نوجوان موبائل فون کے استعمال میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کر رہے ہیں، یہاں تک کہ خاندان کے افراد ایک جگہ بیٹھے ہوں تو بھی ہر شخص اپنے موبائل میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ اس صورتِ حال سے خاندانی روابط اور باہمی میل جول بھی متاثر ہو رہا ہے۔ اس لیے موبائل فون اور سوشل میڈیا کے متوازن اور ذمے دارانہ استعمال کے حوالے سے بچوں، نوجوانوں اور والدین میں شعور و آگاہی پیدا کرنا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

ڈاکٹر سیما شفیع صاحبہ کا کہنا تھا کہ سوشل میڈیا نے تفریح کے روایتی ذرائع، خصوصاً ڈرامے، فلم اور تھیٹر کے کردار کو بڑی حد تک بدل دیا ہے۔ ایک وقت تھا جب بچے شوق سے ڈرامے اور فلمیں دیکھتے، تھیٹر جاتے اور ان ذرائع سے نہ صرف تفریح حاصل کرتے، بلکہ بہت کچھ سیکھتے بھی تھے۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ موبائل فون اور سوشل میڈیا نے بچوں کی توجہ اس قدر اپنی طرف مبذول کر لی ہے کہ وہ کھانے کے دوران بھی موبائل استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ڈراما، فلم اور تھیٹر کے تمام اثرات منفی ہیں۔ اگر انہیں مثبت اور تعمیری انداز میں استعمال کیا جائے تو یہ بچوں کی تربیت اور شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک میں بچوں کو شروع ہی سے کتاب، تھیٹر اور فلم سے جوڑا جاتا ہے۔ انہیں گھروں اور تعلیمی اداروں میں اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ معیاری تفریح کے ساتھ ساتھ مطالعہ اور تخلیقی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی لیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں والدین بچوں کے ساتھ سینما جاتے ہیں، تھیٹر دیکھتے ہیں اور فلم کو محض تفریح نہیں، بلکہ تربیت اور سیکھنے کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ دنیا بھر میں بچوں کے لیے بننے والے ڈراموں اور کرداروں نے کئی نسلوں کی تربیت اور ذہنی نشوونما پر اثرات مرتب کیے ہیں۔ امریکہ کا ''ٹام اینڈ جیری'' دنیا بھر کے بچوں میں بے حد مقبول رہا ہے اور اس کے کردار آج بھی بچوں کی تفریح کا اہم ذریعہ ہیں۔ برطانیہ کا ''مسٹر بین'' بھی ایک ایسا مقبول کردار ہے جس نے بغیر زیادہ مکالموں کے مزاح، معاشرتی رویوں اور انسانی مسائل کو پیش کیا۔ جاپان کا ''ڈورے مون'' بھی بچوں میں بے حد مقبول ہے اور اس میں تخیل، دوستی، مسائل کے حل اور مختلف معاشرتی پہلوؤں کو دلچسپ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ بھارت میں ''شکتی مان'' اور ''حاتم'' جیسے پروگرام اور کردار بچوں میں خاصے مقبول رہے، جبکہ پاکستان میں ہماری نسل نے ''عینک والا جن'' اور ''الف لیلیٰ'' جیسے ڈراموں سے بھرپور لطف اٹھایا۔ ان ڈراموں کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں بچوں کی دلچسپی کے عناصر کے ساتھ ساتھ معاشرتی مسائل، اخلاقی اقدار، تخیل، مہم جوئی اور سبق آموز پہلو بھی شامل ہوتے تھے۔ بچے انہیں صرف دیکھتے نہیں تھے، بلکہ ان کے کرداروں اور کہانیوں سے متاثر بھی ہوتے تھے۔ بدقسمتی سے آج ہمارے ہاں بچوں کے لیے ایسا معیاری اور بامقصد مواد کم دکھائی دیتا ہے جو ماضی کے مقبول پروگراموں کا مقابلہ کر سکے۔ سوشل میڈیا اور مختصر ویڈیوز نے بچوں کی توجہ اور مطالعے کی عادت کو بھی متاثر کیا ہے۔ ہمیں ماضی کے کامیاب ڈراموں سے سبق سیکھتے ہوئے ایسے نئے پروگرام تیار کرنے چاہییں جو بچوں کو تفریح بھی دیں، ان کی تخلیقی صلاحیتیں بھی اجاگر کریں اور اخلاقی و معاشرتی تربیت بھی کریں۔ آج کے دور میں ڈراما، فلم اور تھیٹر کی اہمیت ختم نہیں ہوئی، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ذرائع کو جدید تقاضوں کے مطابق بچوں کی مثبت تربیت کے لیے دوبارہ مؤثر بنایا جائے۔

پروفیسر حامد محمود صاحب موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ماضی میں ڈراما، فلم اور تھیٹر معاشرے میں تربیت اور تہذیب سکھانے کا ذریعہ بھی سمجھے جاتے تھے۔ برصغیر کے پرانے معاشرے میں لوگ باقاعدہ تھیٹر دیکھنے کے لیے لکھنؤ جیسے شہروں کا رخ کرتے تھے، حتیٰ کہ بادشاہ

اور وزرا بھی اپنے بچوں کو تھیٹر بھیجتے تھے، تاکہ وہ رکھ رکھاؤ، گفتگو اور معاشرتی آداب سیکھ سکیں۔ اسلام نے معاشرے میں تمام معاملات کو اخلاقی اصولوں اور پاکیزگی کے دائرے میں منظّم کیا۔ انہوں نے کہا کہ آج موبائل اور سوشل میڈیا کا دور ہے اور ہم بچوں کو ٹیکنالوجی سے مکمل طور پر دور نہیں رکھ سکتے، تاہم اپنے گھروں کا ماحول ضرور تبدیل کر سکتے ہیں۔ اگر والدین اپنے گھروں اور بچوں کی تربیت پر توجہ دیں تو معاشرے کی بہت سی خرابیاں خود بخود کم ہوسکتی ہیں۔ آج ہر بچے کے ہاتھ میں موبائل ہے، اس لیے والدین کی ذمے داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ہمیں مغرب کی اندھی تقلید کے بجائے اپنی اسلامی اقدار، تہذیب اور ثقافت کو سامنے رکھنا چاہیے۔ مسلمانوں کا اپنا ایک نظامِ زندگی اور اپنا ثقافتی و معاشرتی رکھ رکھاؤ ہے جسے ہمیں نئی نسل تک منتقل کرنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ ڈراموں میں بعض اوقات طوفانِ بدتمیزی اور نامناسب موضوعات و مکالمے دیکھنے کو ملتے ہیں، جن کے بچوں اور نوجوانوں پر منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ تاہم مسئلے کا حل صرف دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانا نہیں، بلکہ اپنے گھروں سے تبدیلی کا آغاز کرنا ہے۔ مقرر نے کہا کہ بچوں کی تربیت صرف تعلیم تک محدود نہیں، بلکہ ان کے کھانے پینے کے طریقے، اندازِ گفتگو، لباس، نشست و برخاست اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ تک پھیلی ہوئی ہے۔ معاشرہ انسانوں سے بنتا ہے، اگر انسان بگاڑ کی طرف چلا جائے تو معاشرہ بھی بگڑتا ہے، لیکن اگر انسان اچھائی، اخلاق اور کردار کی طرف آئے تو معاشرے میں بھی بہتری پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ موبائل، انٹرنیٹ اور جدید ٹیکنالوجی بذاتِ خود برے نہیں۔ اگر انہیں مثبت اور تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ علم اور تربیت کا مؤثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔

ماہر تعلیم فاطمہ افضال صاحبہ نے فرمایا کہ 90 کی دہائی میں ہم خاندان کے ساتھ مل کر ڈرامے اور فلمیں دیکھا کرتے تھے، جن سے ہماری تربیت بھی ہوتی تھی۔ خواہ ''عینک والا جن'' ہو یا ''اندھیرا اُجالا''، ان ڈراموں میں تفریح کے ساتھ تربیتی پہلو بھی موجود تھا۔ آج ہر بچے کے ہاتھ میں موبائل ہے اور سوشل میڈیا کا پھیلاؤ اتنا بڑھ چکا ہے کہ اسے قابو کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ نئی نسل کو درست سمت دینے میں میڈیا، فلم اور ڈراما اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اگست کے دنوں میں ماضی میں ملی نغمے بڑے شوق سے سنے اور گائے جاتے تھے، جن سے بچوں اور نوجوانوں میں وطن سے محبت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ افسوس کہ آج نئی نسل میں ملی نغموں کا تصور تقریباً ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملی نغموں کو دوبارہ فروغ دیا جائے، نوجوانوں میں شعور اجاگر کیا جائے اور انہیں پاکستان سے محبت اور وابستگی کے جذبے سے جوڑا جائے۔

لکھاری سیدہ فاطمہ بتول گیلانی صاحبہ نے فرمایا کہ انسان وہی چیز اپناتا ہے جو وہ اپنے اردگرد دیکھتا ہے۔ آج کے حالات ہمارے اپنے جذبات اور معاشرتی رویوں کا نتیجہ ہیں۔ لکھاری بھی اپنے ماحول اور معاشرے میں جو کچھ دیکھتے ہیں، اسے اپنی تحریروں میں پیش کرتے ہیں تاکہ لوگ اس سے کوئی اچھا سبق حاصل کریں اور دین و اخلاق کی راہ پر چلیں۔ اگر ہم اپنے ذہن اور کردار کو درست کر لیں تو نہ ''ڈورے مون'' جیسے کردار ہم پر اثر انداز ہوں گے اور نہ ہی کوئی منفی سرگرمی۔ مردوں اور عورتوں، دونوں کو چاہیے کہ وہ درست راستے کا انتخاب کریں۔

سہراب علی صاحب کا کہنا تھا کہ اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور عبیداللہ عبید اسی معاشرے کی پیداوار ہیں۔ خرابی صرف فلم، ڈرامے یا تھیٹر میں نہیں، بلکہ ہمارا معاشرہ ایک عرصے سے انحطاط کا شکار ہے اور مسلسل تنزلی کی طرف جا رہا ہے۔ حکومت کو معاشرے کی رہنمائی اور اصلاح کے لیے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا، کیوں کہ حکومتی سرپرستی اور درست رہنمائی کے بغیر ہم حقیقی ترقی نہیں کر سکتے۔ معاشرتی خامیوں کے خاتمے کے لیے ہمیں بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا اور خصوصاً بچوں کی تربیت اور ان پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

میاں انور سید صاحب نے فرمایا کہ فلم، تھیٹر اور ڈراما معاشرے کی اصلاح پر اثر انداز ہوتے ہیں، تاہم اصل ذمے داری تربیت اور کردار سازی کی ہے۔ اگر ہم اپنی اور اپنے بچوں کی تربیت پر توجہ دیں اور تعلیمی ادارے تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت کو بھی اہمیت دیں تو معاشرے میں مثبت تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ ہم بچوں سے اچھے نمبروں کی توقع رکھتے ہیں، مگر ان

کے اخلاق اور کردار پر مطلوبہ توجہ نہیں دیتے۔ موجودہ دور کے بعض ٹی وی ڈرامے بھی قابلِ اعتراض مواد اور نامناسب لباس کے باعث معاشرتی اقدار پر منفی اثر ڈال رہے ہیں۔ ماضی میں سنسر بورڈ زیادہ فعال تھا اور 1980ء کی دہائی کے ڈرامے نہ صرف پاکستان، بلکہ بھارت میں بھی مقبول تھے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام غیر معیاری اور نامناسب مواد کو دیکھنے اور لائیک کرنے سے گریز کریں، جب کہ متعلقہ ادارے سنسر کے نظام کو بہتر بنائیں۔ ہمیں اپنی اخلاقی اقدار کو ہر صورت برقرار رکھنا ہوگا اور معاشرے کی اصلاح کا آغاز خود اپنی ذات اور اپنے گھر سے کرنا ہوگا۔

قاری شاہد اعظم الاذہری صاحب نے اظہارِ خیال کیا کہ ماضی میں ٹی وی پروگرام تلاوتِ قرآن پاک سے شروع ہوتے تھے، جب کہ خواتین خبرنامہ پڑھتے وقت دوپٹہ اوڑھتی تھیں، مگر آج میڈیا کے انداز میں نمایاں تبدیلی آچکی ہے۔ ناچ گانے اور غیر مناسب مواد سے بچوں کو کیا سیکھنے کو ملے گا؟ انہوں نے کہا کہ اساتذہ، مساجد و منبر اور حکومت سب کی ذمے داری ہے کہ معاشرے کی اصلاح میں اپنا کردار ادا کریں۔ موجودہ ڈراموں کے منفی اثرات سے بچوں کو محفوظ رکھنے کے لیے والدین کو بھی خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

ہمدرد شوریٰ (راولپنڈی/اسلام آباد) اجلاس

ہمدرد شوریٰ (راولپنڈی/اسلام آباد) کے اجلاس میں محترم امتیاز حیدر (اسپیکر)، محترم پروفیسر نیاز محمد عرفان، محترم پروفیسر زاہد علی قریشی، محترم پروفیسر ڈاکٹر ریاض احمد، محترم حکیم بشیر بھیروی، محترم طارق شاہین، محترمہ سلمیٰ قاصر، محترم نعیم اکرم قریشی، محترم اسلام الدین قریشی، محترم تنویر نصرت، محترم انجینئر مظفر اقبال، محترم پروفیسر اقبال ناصری اور محمد ایوب ایڈووکیٹ جبکہ میڈیا کے کارکنان میں نیو ٹی وی کے سینئر اینکر پرسن خالد محمود چودھری، چینل (A-1) سے سینئر اینکر پرسن سیّد آصف علی، پی ٹی وی کے سینئر اینکر پرسن مظہر قریشی کے علاوہ مبصرین کی کثیر تعداد اور ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان (راولپنڈی/اسلام آباد) سے محترم امان نیازی نے شرکت کی۔ اجلاس میں محترمہ اسماء بٹ (معروف سینئر ڈائریکٹر، پروڈیوسر و ڈراما نگار) کو بطور مہمان مقرر مدعو کیا گیا۔

محترم اسپیکر نے اجلاس کی کاروائی کا با قاعدہ آغاز کرتے ہوئے ابتدائی کلمات میں مہمان مقررہ محترمہ اسماء بٹ صاحبہ کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ آپ معروف سینئر ڈائریکٹر، پروڈیوسر و ڈراما نگار ہیں اور میڈیا کی دنیا میں ایک نمایاں مقام بنا چکی ہیں۔ آپ خاندانی اور معیاری اسٹیج ڈراموں کے فروغ کے لیے جانی جاتی ہیں اور خاص کر اسٹیج ڈراموں میں پیش کیے جانے والے غیر اخلاقی مواد کی سخت ناقد ہیں۔ آپ فنکاروں اور میڈیا کمیونٹی کی فلاح کے لیے کام کرنے کے حوالے سے کافی متحرک ہیں۔ آپ کی بنیادی توجہ فیملی تھیٹر کی ترویج پر ہے اور آپ کی ہمیشہ سے ہی یہ جدوجہد رہی ہے کہ اسٹیج اور میڈیا پر ایسا تفریحی مواد پیش کیا جائے جو خاندانی اقدار کے مطابق ہو اور معاشرے میں مثبت پیغام دے۔ آپ کورونا کے وقت چیریٹی میں پیش پیش رہیں۔

آج کا موضوع عصرِ حاضر کے اہم موضوعات میں سے ایک ہے یہ موضوع محض فنونِ لطیفہ یا تفریح تک محدود نہیں، بلکہ ہماری تہذیب، اخلاقی اقدار، قومی شعور اور آنے والی نسلوں کی فکری و اخلاقی تربیت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا فلم، تھیٹر اور ڈراما صرف تفریح کا ذریعہ ہیں یا معاشرے کی اصلاح میں بھی مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں؟ میری رائے میں اگر ان ذرائع کو ذمے داری اور مثبت مقصد کے ساتھ استعمال کیا جائے تو یہ معاشرتی تبدیلی کے طاقتور وسائل ثابت ہو سکتے ہیں۔ موضوع پر مزید بحث کے لیے مہمان مقرر کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔

مہمان مقررہ محترمہ اسماء بٹ نے اپنے کلیدی خطاب میں مذکورہ موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمدرد شوریٰ میں شرکت کرنا میرے لیے باعث اعزاز ہے آج کا موضوع انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ ایک معیاری فلم، با مقصد ڈراما اور مؤثر اسٹیج پرفارمنس لاکھوں افراد کی سوچ بدل سکتی ہے۔ فلم، تھیٹر اور ڈراما صدیوں سے انسانوں کو محظوظ کرنے کے ساتھ انہیں سوچنے پر مجبور کرتے آئے ہیں۔ یہ صرف تفریح کا ذریعہ نہیں، بلکہ معاشرے کی اصلاح کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ فلم اور ڈرامہ آئینے کی طرح ہوتے

ہیں یہ معاشرے کی اچھائی اور برائی دونوں دکھاتے ہیں۔تھیٹر اور ڈرامے کے ذریعے مشکل پیغام کو آسان انداز میں پہنچایا جا سکتا ہے ۔یہ مختلف قومیتوں، زبانوں اور طبقات کو ایک ساتھ بٹھا کر ایک پیغام دیتے ہیں ، ہماری ثقافت ، زبان اور تاریخ کو زندہ رکھتے ہیں اور لوگوں میں محبت اور رواداری پیدا کرتے ہیں ۔فلم اور تھیٹر آج کے دور میں ذرائع ابلاغ کے بہت بڑے ذرائع ہیں یہ زہر بھی بن سکتے ہیں اور دوا بھی۔فلم بنا دینا کافی نہیں ہوتا اسے مسائل کے حل کے ساتھ پیش کیا جائے اور مایوسی نہ پھیلائی جائے۔ شہید حکیم محمد سعید کی زندگی پر اگر فلم یا ڈراما بنے تو لوگوں میں ''خدمتِ خلق'' کا جذبہ پیدا ہوگا۔فلم کے بعد اگر کوئی چیز سب سے زیادہ اثر رکھتی ہے تو وہ کیمرہ اور اسٹیج ہے۔فلم تھیٹر اور ڈراما لوگوں کے جذبات کو چھو کر انہیں ہنساتے بھی ہیں اور رلاتے بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر ہمیں بہتر انسان بننے کی ترغیب بھی دیتے ہیں ۔ پرانے زمانے کے ڈراموں نے ہمیں سکھایا کہ سادگی، عزت اور محبت کیا ہوتی ہے اگر آج بھی ہم اسی معیار پر کام کریں تو فلم اور تھیٹر دوبارہ قوم کی سوچ بدل کر اسے بہتر بنا سکتے ہیں اور ان ذرائع کو ذمے داری سے استعمال کیا جائے تو یہ واقعی معاشرے کی اصلاح کا سب سے مؤثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔

موضوع کا تفصیلی جائزہ اور تبادلۂ خیال کے بعد فاضل اراکین شوریٰ کی آراء سے مندرجہ ذیل نکات مرتب کیے گئے۔

☆برّصغیر پاک و ہند میں جب ہندوستان تقسیم نہیں ہوا تھا۔ڈرامے ،تھیٹر مختلف زبانوں میں پیش کیے جاتے تھے آغا حشر کاشمیری ،امتیاز علی تاج اس انڈسٹری میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے آج کا پیغام جو محترمہ صدر صاحبہ کی طرف سے موصول ہوا ہے وہ سارا اسی متعلق ہے پیغام میں پاکستان کی ثقافت کو نمایاں کیا جا رہا ہے ماضی میں ڈرامے اور فلمیں ہماری تہذیب کے خلاف نہیں ہوتی تھی اور عام لوگوں کی زندگی ،ان کی مشکلات اور روزمرہ کے حالات پر مبنی ہوتے تھے، ہر کہانی کا ایک واضع پہلو ہوتا تھا جو ناظرین کو اچھی باتیں سکھاتا تھا۔آج کوئی ڈراما، فلم، تھیٹر فیملی میں بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتا میڈیا انڈسٹری انتہائی اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے۔حکومت کی بھی اوّلین ذمے داری بنتی ہے کہ وہ میڈیا کے اچھے کام کو سپورٹ کریں اور غیر اخلاقی مواد کے خلاف کریک ڈاؤن کریں اور ان کی اصلاح کریں۔

☆ آج کا عنوان اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ فلم، تھیٹر اور ڈرامے ہماری کس طرح اصلاح کر رہے ہیں؟ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ ''تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے'' ایک اور جگہ ارشاد فرمایا کہ ''میں نے جن و انس کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں'' زندگی کا مقصد ہی یہی ہونا چاہیے کہ ایسا کوئی بھی کام ،رسم یا عقیدہ جو قرآن و سنّت کی تعلیمات سے متصادم ہو اس سے اجتناب کیا جائے۔ذرائع ابلاغ کو اچھے کام میں استعمال کیا جائے جو معاشرے میں اچھائی کو پھیلائیں اور برائی کو روکیں (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) بھی اسی زندگی کا حصہ ہے۔میڈیا کے ذریعے قرآن وسنّت کی تعلیمات کو عام کیا جائے اور اپنی روزمرّہ زندگی کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالا جائے۔ایسے پروگرامز، ویڈیوز اور تحریروں کا انتخاب کریں جو علم میں اضافہ کریں اور اخلاقی اقدار کو بہتر بنائیں۔ فحاشی، جھوٹ، غیبت اور غیر اخلاقی مواد سے مکمل پرہیز کریں۔

☆ آج کا موضوع انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ میڈیا انڈسٹری اور فلم سینسر بورڈ میں لیڈر شپ بہت ضروری ہے، کیوں کہ یہ معاشرتی اقدار کے تحفظ اور جدید رجحانات کے درمیان توازن قائم کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔بہترین قیادت تخلیق کاروں کو ایسے موضوعات پر کام کرنے کی تحریک دیتی ہے جو تفریح کے ساتھ ساتھ معاشرتی شعور بھی بیدار کرتی ہے ۔ایک ذمے دار قیادت نہ صرف ملکی قوانین کا مؤثر نفاذ ممکن بناتی ہے، بلکہ تخلیقی آزادی اور اخلاقی حدود کے درمیان توازن بھی قائم رکھتی ہے۔لیڈر شپ کا کام ہے کہ ملکی روایات، تہذیب، ثقافت ، مذہبی اقدار اور سماجی اصولوں کی پاسداری کو یقینی بنائے۔ایسے مواد کی روک تھام کرے جو معاشرے میں بگاڑ، منفی روّیوں کو فروغ دیتے ہیں۔ آج ہمیں اپنی میڈیا انڈسٹری اور فلم سینسر بورڈ کی اصلاح کرنی ہوگی، تاکہ ہماری مثبت ثقافت کو پذیرائی مل سکے اور بیرون ممالک میں ہماری فلم انڈسٹری کو ایک اچھا مقام مل سکے۔

☆ قرآن مجید میں سورۃ نحل میں ارشاد ہے کہ ''لوگوں کو اللہ کے راستے میں بلانے کے بہترین،

حکمتیں اور نصیحتیں اختیار کرو‘‘مذکورہ موضوع فلم،تھیٹر اور ڈرامے بذاتِ خود اچھے یا برے نہیں ہوتے بات مقصدیت اور پیغام کی ہوتی ہے۔کہانی لکھنے والے کے تخیل پر انحصار کرتا ہے کردار میں اگر بے حیائی ،تشدد اور سنسنی کا پہلو نمایاں ہوتو معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اگر عدل و انصاف ،ظلم کے خاتمے، بردباری اور برداشت کے فروغ کی بات ہوتو معاشرہ سنورتا ہے ۔سنسر بورڈ SOPs ملکی ثقافت، مشرقی روایات کے مطابق وضع کرے۔فلم،تھیٹر اور ڈراموں سے محض کاروباری مفاد ہی نہیں، بلکہ نسلِ نوء کی تربیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرے۔کردار آسان فہم اور دلچسپ ہونے چاہئیں اور دانشوروں کو اپنی ذمے داریاں نبھانی چاہئیں ۔شہید حکیم محمد سعید نے بچوں کے لیے بے شمار کتابیں لکھیں جو سبق آموز تھیں اور ہر آنے والی نسل کے لیے مشعل راہ ہیں۔

☆اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی میں جب صرف PTV تھا تو لوگ بڑے ذوق وشوق سے ٹی وی دیکھتے تھے اور ڈرامے پاکستان کے چاروں صوبوں سے نشر کیے جاتے تھے ان ڈراموں میں نہ صرف تفریح طبع کا سامان ہوتا تھا، بلکہ ناظرین کو سیاسی وسماجی اور معاشی مسائل سے متعلق ہی ان ڈراموں کے ذریعے آگاہی دی جاتی تھی ماضی میں فلموں کے لیے لوگ خاص طور پر سینما گھروں کا رخ کرتے تھے،لیکن پھر موبائل اور انٹرنیٹ نے ان سینما گھروں کی اہمیت کو نہ صرف کم کر دیا، بلکہ ختم کر دیا پھر سینما گھر بند ہونا شروع ہو گئے آج صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کے بڑے شہروں میں اکا دکا سینما گھر ہیں۔آج جو ڈرامے بن رہے ہیں وہ انتہائی گراوٹ کا شکار ہیں اور نسل نو پر منفی اثرات مرّتب کر رہے ہیں ۔ پروڈیوسر اور ڈراما نگار کو چاہیے کہ وہ ایسے موضوعات کو ڈراموں کا حصہ بنائیں جس سے معاشرے میں بہتری ممکن ہو اور نوجوان نسل کی اخلاقی تربیت ہو سکے۔

☆ آج کل ہمارا معاشرہ کافی بگاڑ کا شکار ہے ۔ میڈیا کسی بھی معاشرے کی ثقافت ،اقدار اور سوچ کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے ۔ اچھے ڈرامے اور معیاری نشریات نہ صرف تفریح کا ذریعہ ہیں، بلکہ یہ دنیا بھر میں ملک کی مثبت پہچان بنانے میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں ڈراموں اور پروگرامز کے ذریعے ، بھائی چارہ، ایمانداری، بڑوں کا احترام اور ہمدردی جیسے مثبت روّیے اجاگر کیے جائیں۔ایسے موضوعات پیش کیے جائیں جو خاندانی نظام کو مضبوط کریں اور لوگوں میں برداشت پیدا کریں ۔معیاری ڈراموں کے ذریعے اپنی تاریخ،تہوار اور خوبصورت اقدار کو دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں۔جدید ٹیکنالوجی ،بہترین اداکاری اور اعلیٰ معیار کی ڈائریکشن کا استعمال کیا جائے ،تاکہ عالمی مارکیٹ میں پذیرائی مل سکے۔ایسے پروگرامز نشر کیے جائیں جو دنیا میں امن ،رواداری اور انسانیت دوستی کا مثبت تاثر قائم ہو سکے۔اچھے پروگرامز بنانے والے فنکاروں، مصنفین اور پروڈیوسرز کی حکومتی سرپرستی کی جائے اور انہیں اعزازات سے نوازا جائے۔میڈیا ہاؤسز ناظرین کی آراء کو مدِنظر رکھیں اور ایسے پروگرامز تشکیل دیں جو ہر عمر کے افراد(بچوں ،نوجوانوں اور بزرگوں) کے لیے یکساں موزوں ہوں۔

☆موجودہ دور کے ڈراموں ،فلم اور تھیٹر میں ماضی کی نسبت معیار کا کافی فرق ہے جو ایک مسلمّہ حقیقت ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ماضی میں ڈرامے کی کہانی،مکالموں اور اداکاروں کی تربیت پر بہت زیادہ محنت کی جاتی تھی جب کہ آج کل کے ڈراموں میں کافی عوامل بدل چکے ہیں ۔بہترین کیمرے ،خوبصورت لوکیشنز اور شاندار موسیقی پر زیادہ زور ہوتا ہے جس کی وجہ سے اکثر کہانیاں اور سکرپٹ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ماضی میں اسکرپٹ اور ڈائریکشن سب سے مضبوط حصہ ہوتے تھے۔PTV پر جب وارث ڈراما پیش کیا جاتا تھا تو مارکیٹیں بند ہو جاتی تھیں۔ رائٹر اچھے موضوعات کا انتخاب کریں۔نوجوان نسل بہت ہی بدحالی کا شکار ہے ہر بچے کے پاس ذرائع ابلاغ کے حوالے سے آلات موجود ہیں، لیکن ان کو مثبت استعمال کی بجائے زیادہ منفی استعمال کیا جا رہا ہے ۔ پیمرا کے اختیارات کو مزید بڑھایا جائے او رایسے اداروں میں رولز ریگولیشنز ہونے چاہئیں اور ان پر سختی سے عمل درآمد ہونا چاہیے۔آج کی نسل کا اندازِ اداکاری زیادہ حقیقت پسندانہ اور سادہ ہے جب کہ ماضی کے فلم، ڈراموں اور تھیٹر میں الفاظ کی ادائیگی، تلفظ اور جذبات کا اظہار بہت گہرا اور ڈرامائی ہوتا تھا جو لوگوں کے دلوں میں اتر جاتا تھا۔نئی

نسل کے فنکاروں میں ٹیلنٹ کی کوئی کمی نہیں ہے اگر انہیں معیاری اسکرپٹ، مناسب وقت اور تربیت فراہم کی جائے تو وہ بھی ماضی کی طرح لازوال کردار ادا کر سکتے ہیں۔

☆ آج کا موضوع دلچسپ ہے ایسے لگتا ہے جیسے ساٹھ سال پہلے کے پُرسکون معاشرے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں ۔ جب فلمیں اگرچہ گونگی ہوتی تھیں، لیکن کرداروں کی زبان ، ناظرین کو باکردار بناتی تھی۔ جب اداکار اور گلوکار ،لکڑیوں کے پھٹوں سے بنائے گئے تخت پر اپنی حقیقی اداکاری اور گلوکاری سے تھیٹر کا سماں باندھتے تھے تو معاشرے میں اخوّت و محبت، وطنِ پاک سے محبت اور دینی اقدار سے محبت کے سارے ہی سارے رنگ دل و دماغ پر قوس وقزاح کے سارے ہی حسین وجمیل رنگ جما دیتے تھے۔ ہمارے اسٹیج ڈرامے جذبۂ جہاد کو اُجاگر کرتے تھے۔ آج اسی گہوارے کو گہری نظر لگ گئی آج ہمارے تمدّن سے تعفّن کی بُو آ رہی ہے۔ ہماری تہذیب گراوٹ اس اسٹیج پر پہنچ چکی ہے کہ اب یہی تہذیب گویا ہوا کے دُوش پر رکھا ہوا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہے۔ آج کے میڈیا پر انگلی اٹھانا بنتی ہے جہاں ایسا مواد نشر کیا جاتا ہے جو نوجوان نسل کو غیر اخلاقی بنا رہا ہے جب کہ میڈیا کا کردار مثبت ہونا چاہیے اور ایسا مواد پیش کیا جانا چاہیے جس سے نوجوان نسل مثبت سرگرمیوں کی طرف راغب ہو سکے ۔ انہیں اپنی صلاحیتوں کو پہچاننے اور ملک کی ترقی میں کردار ادا کرنے کی ترغیب دی جائے۔

☆ زیر بحث موضوع معاشرے کی اصلاح اور بگاڑ نے کے بھی ذمے دار گردانے جا سکتے ہیں یہ تینوں حرف فلم، تھیٹر او ر ڈرامے صرف تفریح نہیں، بلکہ معاشرے کا اصل عکس اور اسے تبدیل کرنے کا مؤثر ہتھیار بھی ہے ۔تھیٹر ایک قدیم فن ہے جو ہماری زبان لب ولہجہ، کہانیوں اور روایات کو زندہ رکھتا ہے اسٹیج ڈراما ایک ہی رات میں سینکڑوں لوگوں کے دلوں میں اپنی بات جاگزیں کر دیتا ہے۔تھیٹر کے بعد خاموش فلموں کا دور بھی بہت مشہور ہوا چارلی چپلن جیسے فنکار نے لوگوں کو بدرجہ دائم محفوظ کیا جب کہ بقول چارلی چپلن'' مجھے بارش پسند ہے ، کیوں کہ اس میں میرے آنسو کسی کو نظر نہیں آتے'' پرانے ادوار میں فنکاروں کی اجرت بہت کم ہوتی تھی جس کی وجہ سے چارلی چپلن نے یہ الفاظ کہہ کر اپنی بے بسی اور غربت کا اظہار کیا۔ اگر فلم اور ڈرامے کی بات کی جائے تو ہم پرانی پاکستانی فلمیں اور PTV کے ڈرامے دیکھ کر اس وقت کی تہذیبی روایات کو سمجھ سکتے ہیں جن میں شرافت، پاکیزگی اور باہمی عزت ووقار کا خیال رکھا جاتا تھا جب کہ اب اسٹیج ڈراموں اور کسی حد تک فلموں میں غیر شائستہ جملے بازی انتہا کو چھو رہی ہے جسے فوری لگام ڈالنے کی ضروت ہے ورنہ معاشرے کی تباہی دور نہیں۔ تھیٹر ایک بہت مشکل ذریعۂ اظہار ہے، کیوں کہ اس میں لائیو پرفارمنس ہوتی ہے اور غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی جس کی وجہ سے اداکار اور سامعے کا براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ میڈیا کی ذمے داری ہونی چاہیے کہ ایسے ٹاک شوز اور دستاویزی پروگرامز بنائیں جو لوگوں کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو بڑھائیں۔

☆ فلم سینسر بورڈ کی ذمے داری ہے کہ وہ اسکرپٹ کو دیکھے اور اگر اس میں غیر اخلاقی مواد ہو تو اسے ہٹا دینا چاہیے، کیوں کہ ہماری اسلامی فلاحی ریاست ہے اور ہمارا مذہب قطعاً ایسی چیز کو پسند نہیں کرتا جو مذہب کے منافی ہو۔ فلم، تھیٹر یا ڈراما کو پیش کرتے وقت ملکی ثقافت ، مذہب اور روایات کے مطابق مواد کو یقینی بنایا جائے۔ بچوں اور نوجوانوں کو ذہنی اور اخلاقی طور پر خراب کرنے والے اثرات سے بچایا جائے۔ والدین کی بھی اوّلین ذمے داری ہونی چاہیے کہ وہ بچوں کو موبائل، ٹی وی ڈراموں اور فلم کی نیگیٹیویٹی سے دور رکھیں، کیوں کہ یہی نوجوان مستقبل کی ضمانت ہیں۔

☆ دنیا کے مختلف ممالک میں تھیٹر کو سماجی اصلاح، شہری شعور، صحت عامہ اور انسانی حقوق کے فروغ کے لیے کامیابی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان بھی اس حوالے سے ایک قابلِ فخر روایت رکھتا ہے ہمارے ممتاز ادیبوں اور ڈراما نگاروں نے ایسی تخلیقات پیش کیں جنہوں نے نہ صرف معیاری تفریح فراہم کی، بلکہ تہذیب ، خاندانی اقدار اور فکری بالیدگی کو بھی فروغ دیا۔ ریاستی اداروں، میڈیا ہاؤسز، ادیبوں، فنکاروں، اساتذہ، والدین اور خود ناظرین سب کی مشترکہ ذمے داری ہے کہ وہ ایسے تخلیقی رجحانات کی حوصلہ افزائی کریں جو معاشرے میں خیر، رواداری، انصاف، امید اور مثبت سوچ کو فروغ دیں قرآن

میں ارشاد ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے'' یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہماری ہر صلاحیت، ہر فن اور ہر ذریعۂ ابلاغ کا مقصد خیر، عدل اور انسانیت کی خدمت ہونا چاہیے۔

☆فلم، ڈراما اور تھیٹر معاشرے کی اصلاح میں ایک طاقتور کردار ادا کرتے ہیں ان کا بنیادی مقصد لوگوں کی سوچ کو مثبت سمت دینا، سماجی برائیوں کو اجاگر کرنا اور اخلاقی اقدار کو فروغ دینا ہے۔ یہ ذرائع ابلاغ عوام کو تفریح کے ساتھ ساتھ زندگی کے حقائق سے روشناس کرواتے ہیں۔ ڈرامے اور فلمیں اچھے اور برے کرداروں کے انجام کو دکھا کر لوگوں کو نیکی کی ترغیب دیتے ہیں اور برائی کے نتائج سے خبردار کرتے ہیں کرداروں کی کہانیوں کے ذریعے لوگوں کو اپنی ذاتی زندگی کی غلطیوں کو سدھارنے کا موقع ملتا ہے۔

☆محترم اسپیکر نے اپنے اختتامیہ میں ارکان شوریٰ کے نہایت ہی مدلل دلائل سننے کے بعد موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید نوجوانوں کی اخلاقی اور فکری تربیت کو قومی ترقی کی بنیاد کرار دیتے تھے ان کے نزدیک مضبوط کردار ہی مضبوط قوم کی اساس ہے فلم، تھیٹر اور ڈراما قوم کی کردار سازی کا مؤثر ذریعہ بن سکتے ہیں فلم اور ڈراما، سچائی، دیانت، انصاف، برداشت، والدین کے احترام، خواتین کے وقار، تعلیم، خدمتِ خلق، حب الوطنی اور قومی یکجہتی جیسے موضوعات کو فنی مہارت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

آیئے! ہم سب یہ عہد کریں کہ اپنے فن، اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور اپنے ذرائع ابلاغ کو صرف تفریح کا ذریعہ نہیں، بلکہ انسان سازی، کردار سازی اور وطنِ عزیز پاکستان کی تعمیر کا مؤثر وسیلہ بنائیں گے، کیوں کہ قوموں کا مستقبل صرف معیشت سے نہیں، بلکہ ان کے کردار، فکر اور ثقافت سے بھی تشکیل پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی صلاحیتوں کو انسانیت کی خدمت، اخلاقی تعمیر اور قومی ترقی کے لیے استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وما علینا الا البلاغ المبین۔

ہمدرد شوریٰ (لاہور) اجلاس

ہمدرد شوریٰ لاہور کے اجلاس میں محترم پروفیسر ڈاکٹر میاں محمد اکرم (اسپیکر)، محترمہ جسٹس ناصرہ جاوید اقبال، محترمہ ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی، محترم ڈاکٹر شفیق جالندھری، محترمہ رضا ریاض، محترم حسیب پاشا، محترم انجم نثار صدیقی، محترم ثمر جمیل خان، محترم پروفیسر نصیر اے چوہدری، محترم شاہد علی خان، محترم حکیم راحت نسیم، محترمہ خالدہ جمیل چوہدری، محترم بریگیڈیئر ریاض احمد طور، محترم رانا امیر احمد خان، محترم کاشف ادیب جاودانی، محترم عثمان غنی جب کہ مبصرین میں محترم انجینئر محمد آصف، محترم محمد زبیر اسماعیل، محترمہ پروفیسر ڈاکٹر پروین خان، محترم محمد نصیر الحق ہاشمی، محترم پروفیسر محمد خالد پراچہ، محترمہ ڈاکٹر بشریٰ مجاہد، محترم پروفیسر مشکور احمد صدیقی، محترم علی رضا، محترم عبدالمنان، محترم انور گوندل، محترم راشد حجازی، محترم مہر عبدالروف، محترمہ ثمن عروج، محترم ڈاکٹر یاسر معراج اور ہمدرد فاونڈیشن کی جانب سے محترم سید علی بخاری (ڈپٹی ڈائریکٹر پروگرامز، لاہور) نے شرکت کی۔ ڈاکٹر لبنیٰ ظہیر (چیئرپرسن شعبہ فلم اینڈ براڈکاسٹنگ، جامعہ پنجاب)، احمر سہیل بسرا (اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان لاہور)، ڈاکٹر فوزیہ تبسم (چیئرپرسن صوفی تبسم آرٹ اکیڈمی) کو بطور مہمان مقررین مدعو کیا گیا۔

مقررین نے اس امر پر اتفاق کیا کہ فلم، تھیٹر اور ڈراما محض تفریح کے ذرائع نہیں، بلکہ رائے عامہ کی تشکیل، فکری بیداری، اخلاقی تربیت، سماجی اصلاح، قومی یکجہتی اور ثقافتی شناخت کے فروغ کے مؤثر ذرائع ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ماضی کی پاکستانی فلموں اور ڈراموں نے خاندانی نظام، مشرقی اقدار، والدین کے احترام، ایثار، دیانت داری، برداشت اور سماجی انصاف جیسے اعلیٰ اوصاف کو فروغ دے کر معاشرے کی مثبت سمت میں رہنمائی کی۔ مقررین نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ حالیہ برسوں میں بعض فلموں، ڈراموں اور خاص طور پر اسٹیج پروڈکشنز میں غیر ضروری سنسنی، سطحیت، تشدد، فحاشی اور غیر اخلاقی رجحانات کو نمایاں کیا جا رہا ہے، جس کے منفی اثرات بالخصوص نوجوان نسل کی فکری اور اخلاقی تشکیل پر مرتب ہو رہے ہیں۔ انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ فلم، تھیٹر اور ڈرامے کو قومی یکجہتی، اخلاقی تربیت، خاندانی استحکام، قانون کی پاسداری، خواتین کے احترام، بچوں کی مثبت تربیت، تعلیم، محنت، برداشت، سماجی ہم آہنگی اور قومی ذمہ داری کے فروغ کے لیے مؤثر انداز میں استعمال کیا جانا چاہیے۔

اس موقع پر اسپیکر پروفیسر ڈاکٹر میاں محمد اکرم نے گفتگو سمیٹتے ہوئے موضوع ''فلم، تھیٹر اور ڈراما: معاشرتی اصلاح اور قومی تعمیر کا مؤثر ذریعہ'' پر روشنی ڈالی اور اصلاح کے لیے درج ذیل نکات پیش کیے ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ

☆ فلم، تھیٹر، ڈراما اور ڈیجیٹل میڈیا آج کے دور میں صرف تفریح کے ذرائع نہیں، بلکہ قوموں کی فکری، اخلاقی، سماجی اور علمی تشکیل کے بنیادی ستون ہیں۔ جدید دور میں میڈیا کو تعلیم، تحقیق، سائنسی شعور، مصنوعی ذہانت (AI)، اختراع (Innovation)، کاروباری صلاحیت، سائبر سکیورٹی، ماحولیات اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے استعمال کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

☆ ریاستی ادارے، میڈیا انڈسٹری، جامعات، ماہرینِ تعلیم، تخلیق کار، مصنفین، ہدایت کار، پروڈیوسرز اور فنکار مشترکہ حکمت عملی اختیار کریں، تاکہ ایسا معیاری، ذمے دار اور تعمیری میڈیا فروغ پائے جو نوجوان نسل میں علم، کردار، تحقیق، اخلاق، ٹیکنالوجی اور قومی خدمت کا جذبہ پیدا کرے۔

☆ پاکستان کو ایک باکردار، علم دوست اور ترقی یافتہ ریاست بنانے میں اپنا مؤثر کردار ادا کرے فلم، تھیٹر اور ڈراموں میں بامقصد، اخلاقی اور تعمیری مواد کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ قومی یکجہتی، دیانت داری، برداشت، خدمتِ خلق اور خاندانی استحکام جیسے موضوعات کو ترجیح دی جائے۔ پیمرا اور سینٹرل بورڈ آف فلم سنسر اپنے ضابطہ اخلاق پر سختی سے عمل درآمد یقینی بنائیں۔

☆ فحاشی، غیر ضروری تشدد، منشیات، نفرت انگیزی اور خاندانی انتشار پر مبنی مواد کی مؤثر حوصلہ شکنی کی جائے۔

☆ قومی ہیروز، سائنس دانوں، مفکرین، تاریخی شخصیات اور تعلیمی موضوعات پر معیاری فلمیں اور ڈرامے تیار کیے جائیں۔

☆ خاندانی تفریح (Family Entetainment) کو فروغ دیا جائے، تاکہ ہر عمر کے افراد بلا جھجک ایک ساتھ پروگرام دیکھ سکیں۔

☆ جامعات، ماہرینِ تعلیم، ماہرینِ نفسیات، سماجی علوم کے ماہرین اور علماء کو میڈیا پالیسی اور تخلیقی عمل میں شامل کیا جائے۔

☆ نوجوان فلم سازوں، ہدایت کاروں، اداکاروں اور ڈراما نگاروں کے لیے میڈیا کی سماجی ذمے داری سے متعلق تربیتی پروگرام منعقد کیے جائیں۔

☆ معیاری تخلیقات کی حوصلہ افزائی کے لیے حکومتی ایوارڈز، گرانٹس اور ٹیکس مراعات فراہم کی جائیں۔

☆ میڈیا لٹریسی کو نصاب اور عوامی آگاہی مہمات کا حصہ بنایا جائے، تاکہ نوجوان میڈیا کا تنقیدی اور ذمے دارانہ استعمال سیکھ سکیں۔

☆ بچوں اور نوجوانوں کے تحفظ کے لیے مؤثر ریٹنگ سسٹم اور نشریاتی اوقات کی پابندی یقینی بنائی جائے۔

☆ فلموں، ڈراموں اور ویب سیریز کے ذریعے مصنوعی ذہانت (AI)، سائبر سکیورٹی، ماحولیات، صحت، سائنسی تحقیق اور جدید علوم کو فروغ دیا جائے۔

☆ ڈیجیٹل میڈیا کو اختراع (Innovation)، تحقیق، کاروباری صلاحیت (Entrepreneurship) اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے مؤثر انداز میں استعمال کیا جائے۔

☆ مصنوعی ذہانت (AI) کے استعمال میں اخلاقی اقدار، قانون، شفافیت اور سماجی ذمے داری کو ہر سطح پر یقینی بنایا جائے۔

☆ قومی میڈیا پالیسی کا بنیادی مقصد صرف تفریح نہیں، بلکہ کردار سازی، علم، تحقیق، ٹیکنالوجی، قومی ترقی اور ایک باشعور، باکردار اور ہنر مند نسل کی تعمیر ہونا چاہیے۔ فلم، تھیٹر، ڈراما اور ڈیجیٹل میڈیا کو قومی تعمیر، معاشرتی اصلاح، اخلاقی تربیت اور جدید علمی و سائنسی شعور کے فروغ کا مؤثر ذریعہ بنانے کے لیے ریاستی اداروں، میڈیا، تعلیمی حلقوں اور سول سوسائٹی کو مشترکہ طور پر عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔

ہمدرد شوریٰ۔ اگست 2026ء
موضوع بحث:
''فلم، تھیٹر اور ڈرامے: معاشرے کی اصلاح کے مؤثر ذرائع''
تحریری طور پر موصول ہونے والی اراکینِ شوریٰ کی سفارشات اور تجاویز

ظفر اقبال
رکن ہمدرد شوریٰ، کراچی

آج کے ڈراموں میں معاشرے کے دو انتہائی متضاد طبقے نمایاں کیے جا رہے ہیں۔ ایک طرف

انتہائی غریب طبقہ دکھایا جاتا ہے اور دوسری طرف انتہائی امیر اور سپر رِچ طبقہ۔ ان دونوں کے درمیان زندگی کے معیار اور طرزِ زندگی کا اتنا بڑا فرق دکھایا جاتا ہے کہ اس سے معاشرے میں احساسِ محرومی اور نفرت بڑھنے کا خدشہ پیدا ہوتا ہے۔

مسئلہ صرف یہ نہیں کہ امیر اور غریب دونوں طبقے کہانی کا حصہ ہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ امیر طبقے کی زندگی، رہن سہن اور شاہانہ طرزِ زندگی کو جس انداز میں پیش کیا جاتا ہے، وہ عام آدمی، خصوصاً نوجوانوں کے ذہنوں پر کیا اثر ڈال رہا ہے، اس پر بھی غور ہونا چاہیے۔

آج ہمارے بہت سے ڈراموں میں کہانی کا پس منظر پاکستان کے بجائے ٹورنٹو، لندن، نیویارک اور ہیوسٹن جیسے بیرونِ ملک شہروں میں دکھایا جاتا ہے، جہاں کروڑوں روپے خرچ کر کے انتہائی پُرتعیش زندگی کے مناظر پیش کیے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہماری تخلیقی صلاحیتوں اور وسائل کو معاشرے کے حقیقی مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا؟ کیا ہم اپنے غریب بچوں، اسکولوں، کالجوں اور یتیموں کے مسائل کو بھی اسی توجہ کے ساتھ اپنی کہانیوں کا حصہ نہیں بنا سکتے؟

میڈیا کے ایک اور اہم پہلو پر بھی ہمیں غور کرنا ہوگا۔ جب خبروں میں حکومت یا کسی بھی طاقتور طبقے پر تنقید کی گنجائش محدود ہو اور حقائق کو مکمل طور پر بیان کرنا مشکل ہو جائے تو صحافت اپنا بنیادی کردار پوری طرح ادا نہیں کر پاتی۔ تنقید کا مطلب محض مخالفت نہیں، بلکہ معاشرے میں موجود مسائل اور حقائق کو سامنے لانا بھی ہے۔

اگر اظہارِ رائے پر بہت زیادہ پابندیاں ہوں اور میڈیا میں صرف ایک ہی نقطۂ نظر پیش کیا جائے تو اس سے معلومات کا ایک محدود اور یک طرفہ ماحول پیدا ہوتا ہے۔ تاہم آج یوٹیوب اور دیگر ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے اظہارِ رائے کے لیے ایک مختلف راستہ پیدا کر دیا ہے۔ وہاں حکومت کے حق اور مخالفت میں مختلف آرا موجود ہیں اور لوگ انہیں سن بھی رہے ہیں، پڑھ بھی رہے ہیں اور اپنی رائے بھی قائم کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آج اطلاعات کا بہاؤ صرف روایتی میڈیا تک محدود نہیں رہا۔ لوگ مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ ایسے میں روایتی میڈیا کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے کہ وہ قابلِ اعتماد، متوازن اور حقائق پر مبنی معلومات عوام تک پہنچائے اور معاشرے کے حقیقی مسائل کو نظر انداز نہ کرے۔

کموڈر (ر) سدید انور ملک
رکن ہمدرد شوریٰ، کراچی

فلم، تھیٹر اور ٹیلی وژن انسانی معاشرے میں بتدریج داخل ہوئے۔ اٹھارہویں صدی سے قبل تھیٹر موجود تھا، اس کے بعد فلم آئی اور پھر ٹیلی وژن نے اپنی جگہ بنائی۔ اگر ہم انسانی سرگرمیوں کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بالآخر ہر انسانی سرگرمی کو کسی نہ کسی معاشی نظام اور معاشی ضرورت کے تحت آگے بڑھنا پڑتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر دور کے دانشور اپنے لیے اور آنے والی نسلوں کے لیے بہتری کے راستے تلاش کرتے رہے ہیں۔ وہ معاشرے کے مسائل اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور ان کے اثرات بالآخر ادب، تھیٹر، فلم اور ٹیلی وژن میں بھی نظر آتے ہیں۔

فلم، تھیٹر اور ٹیلی وژن کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ خیالات اور تصورات کو لوگوں کے سامنے عملی اور مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ خصوصاً ٹیلی وژن ایسا ذریعہ ابلاغ ہے جس کے ساتھ ہم صرف بطور ناظر وابستہ نہیں رہتے، بلکہ بعض اوقات ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود اس کہانی کا حصہ ہیں اور اس کے کرداروں کے ساتھ زندگی کے حالات سے گزر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیلی وژن پر دیکھی جانے والی بہت سی باتیں ہمارے ذہن میں دیر تک محفوظ رہتی ہیں۔

ہم سب نے اسکول اور کالج میں بہت کچھ پڑھا اور عملی مشقیں بھی کیں، لیکن بعض اوقات چند گھنٹوں کی ایک فلم یا چند اقساط پر مشتمل ڈراما ہمارے ذہن پر اس سے کہیں گہرا اثر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلم اور ڈراما کسی خیال کو محض الفاظ میں بیان نہیں کرتے بلکہ اسے کرداروں، واقعات اور جذبات کے ذریعے ہمارے سامنے زندہ کر دیتے ہیں۔

میرے خیال میں ہر اچھی کہانی میں بالآخر اچھائی اور برائی کے درمیان ایک کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ کرداروں کے ذریعے یہ واضح کیا جاتا ہے کہ کون سا راستہ درست ہے اور کون سا غلط۔ کامیابی عموماً اچھے کردار اور اچھے اخلاق رکھنے

والے لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ کہانی کا پس منظر کچھ بھی ہو، اس میں دولت کا ذکر ہو، روزگار کا مسئلہ ہو، روٹی کا سوال ہو یا معاشی جدوجہد۔ بالآخر ناظر کے ذہن میں یہی تصور بیٹھتا ہے کہ اچھے اخلاق اور درست کردار ہی انسان کو کامیابی کی طرف لے جاتے ہیں۔

یہی وہ پیغام ہے جو ہمارے ذہنوں اور خصوصاً ہمارے بچوں کے ذہنوں میں نقش ہو جاتا ہے۔ وہ اچھے کردار کو دیکھتے ہیں اور لاشعوری طور پر اسی کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے فلم، ڈراما اور تھیٹر کا تعلق محض تفریح سے نہیں، بلکہ اخلاقی تربیت اور معاشرتی اقدار سے بھی ہے۔

ہمارے معاشرے میں اخلاقیات کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی بنیاد پر قائم ہوا۔ ہمارے لیے ایک راستہ متعین ہے اور اگر ہم اس راستے پر چلیں گے تو اپنے ان اصولوں اور اقدار سے جڑے رہیں گے جن کی بنیاد پر یہ ملک وجود میں آیا۔ اسی اخلاقی راستے پر آگے بڑھنا ہماری اجتماعی ذمے داری ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر ہم کسی شخص کا ایک طویل لیکچر سنیں تو ضروری نہیں کہ اس کا اثر ہمارے ذہن میں زیادہ دیر تک قائم رہے، لیکن اگر ہم اسی موضوع پر ایک اچھی فلم یا ڈراما دیکھ لیں تو اس کے کردار اور واقعات ہمارے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یاد رہتا ہے کہ اس میں کیا ہوا، کس کردار نے کیا کیا اور آخر کار نتیجہ کیا نکلا۔ یہی وجہ ہے کہ چند گھنٹوں کی ایک فلم یا ڈراما بعض اوقات بچوں کے ذہن پر ان اسباق سے زیادہ گہرا اثر ڈال دیتا ہے جو وہ برسوں اسکول میں پڑھتے ہیں۔

پاکستانی ڈراما اس حوالے سے ایک شاندار روایت رکھتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (UNDP) کی ایک تجزیاتی رپورٹ میں بھی پاکستان اور بھارت کے ڈراموں اور فلموں کا جائزہ لیا گیا تھا، جس میں پاکستانی ٹیلی وژن ڈراموں کو خاص طور پر سراہا گیا۔ ان ڈراموں میں ایسے موضوعات کو اجاگر کیا گیا جو ہمارے معاشرے کے حقیقی مسائل اور سماجی اقدار سے متعلق تھے۔

مثلاً خدا کی بستی میں غریب انسان کے استحصال اور اس کی جدوجہد کو مؤثر انداز میں پیش کیا گیا۔ اسی طرح وارث میں معاشرتی مسائل اور ان سے وابستہ کئی اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا۔ دھوپ کنارے اور تنہائیاں جیسے ڈراموں نے بھی اپنے اپنے انداز میں معاشرتی رویوں اور اقدار کو ناظرین کے ذہنوں میں جگہ دی۔

ان ڈراموں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ہم کس کا استحصال کر رہے ہیں، کن رویوں کو بدلنے کی ضرورت ہے اور معاشرے میں کن اقدار کو فروغ دینا چاہیے۔ میرے نزدیک یہی کسی بھی تخلیقی کام کی اصل کامیابی ہے کہ وہ صرف وقت نہ گزارے، بلکہ ناظر کو سوچنے پر مجبور کرے۔ (Social Values) ہمیں اپنے ڈراموں اور فلموں میں سماجی اقدار کو مزید نمایاں کرنا ہوگا۔

جب تک ہم اپنی فلموں، ڈراموں اور دیگر تخلیقی کاموں میں مثبت سماجی اقدار کو اجاگر نہیں کریں گے، ہم اس میدان میں پیچھے رہتے جائیں گے۔

دنیا کے دوسرے معاشروں میں بھی یہی رجحان دکھائی دیتا ہے۔ یورپ اور امریکا میں بننے والی بہت سی فلمیں صرف تفریح فراہم نہیں کرتیں، بلکہ سماجی اقدار کو بہتر بنانے، نئے تصورات متعارف کرانے اور معاشرے کے سامنے اہم مسائل لانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہمیں بھی اپنی فلم اور ڈراما انڈسٹری کو اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اس حوالے سے بھارتی سینما کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ ایک زمانے میں بھارتی فلمیں پاکستان میں بھی بہت شوق سے دیکھی جاتی تھیں۔ (UNDP) کی اسی رپورٹ میں مدر انڈیا جیسی فلم کا بھی ذکر کیا گیا، جس میں استحصال، غربت اور ایک عورت کی جدوجہد جیسے موضوعات کو نمایاں کیا گیا تھا۔ اسی طرح دو بیگھا زمین، سجاتا اور دامنی جیسی فلموں نے بھی اپنے موضوعات کے ذریعے سماجی مسائل کو اجاگر کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ بھارتی فلمی صنعت نے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری اور جدید تکنیکی وسائل کی وجہ سے فلم سازی میں ہم سے کچھ زیادہ ترقی کی ہے، لیکن پاکستانی ڈراما اپنی معیار اور موضوعات کے اعتبار سے دنیا بھر میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتا ہے۔ ہمیں اس کامیاب روایت کو فلم کے میدان میں بھی آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

میرا یقین ہے کہ فلم، تھیٹر اور ٹیلی وژن کو صرف تفریح کا ذریعہ سمجھنا درست نہیں۔ یہ معاشرے

کی سوچ، رویوں اور اخلاقی اقدار کو تشکیل دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اگر ہم اس طاقت کو مثبت انداز میں استعمال کریں تو ہم اپنی نئی نسل کو صرف کہانیاں نہیں دے سکتے، بلکہ اچھے کردار، بہتر اخلاق اور ایک بہتر معاشرے کا تصور بھی دے سکتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر عمران امین
رکن ہمدرد شوریٰ، کراچی

میں وائس چانسلر ہونے کے ساتھ ساتھ مصنوعی ذہانت (Artificial Inetlligence) کا پروفیسر ہوں اور سوشل میڈیا کے شعبے میں متعدد اسٹارٹ اَپس پر بھی کام کر چکا ہوں۔ اس لیے جب میں آج کے معاشرے کو دیکھتا ہوں تو مجھے مختلف نسلوں کے درمیان ایک واضح فرق اور ایک بڑا جنریشن گیپ نظر آتا ہے۔ ایک طرف ہماری نسل ہے، جس نے اپنا بچپن ایک مختلف ماحول میں گزارا۔ ہم نے ٹیلی وژن پر تنہائی، الفا براؤ چارلی اور اس نوعیت کے ڈرامے دیکھے۔ اس وقت معلومات اور بیانیے کے ذرائع محدود تھے اور زیادہ تر ایک ہی بیانیہ ہمارے سامنے آتا تھا، لیکن آج 2026ء میں جب میں اسی ماضی کو موجودہ دور کے آئینے میں دیکھتا ہوں تو مجھے ایک مختلف منظر اور ایک مختلف نقطۂ نظر دکھائی دیتا ہے۔ میں کسی ایک واقعے یا بیانیے کو حتمی قرار دینے کے بجائے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج کی نسل کے سامنے معلومات کے کئی ذرائع موجود ہیں اور وہ مختلف زاویوں سے چیزوں کو دیکھ سکتی ہے۔

میری نظر میں سوشل میڈیا نے نئی نسل کو ایک ایسی آگاہی دی ہے جو ہماری نسل کے لیے ممکن نہیں تھی۔ آج کے نوجوان اپنے معاشرے میں ہونے والے بہت سے معاملات کو ہم سے زیادہ تیزی سے دیکھتے، سمجھتے اور ان پر ردعمل دیتے ہیں۔ کراچی میں ایک نوجوان کے ساتھ پیش آنے والے ایک واقعے کی مثال میرے سامنے ہے۔ میں اس بچے کا نام نہیں لینا چاہتا، لیکن اس نے ایک اسٹارٹ اَپ شروع کیا تھا۔ اس معاملے میں سوشل میڈیا کے ذریعے جو آگاہی پیدا ہوئی، وہ ہماری نسل شاید پیدا نہ کر پاتی۔ لوگوں نے معاملے کو دیکھا، اس پر بات کی اور ایک طرح سے (Self Corrective Machanism) پیدا ہوا۔ میرے خیال میں معاشرے میں پائیدار تبدیلی اسی وقت آتی ہے جب اصلاح اندر سے پیدا ہو۔ اگر ہم ہر چیز کو زبردستی نافذ کرنے کی کوشش کریں گے تو ممکن ہے وقتی طور پر تبدیلی نظر آئے، لیکن جب تک معاشرہ خود اسے قبول نہیں کرے گا، وہ دوبارہ اسی سمت میں جا سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سوشل میڈیا میں کوئی خرابی نہیں۔ اس کے منفی اثرات بھی ہیں، غلط معلومات بھی پھیلتی ہیں اور بعض اوقات اس کا غلط استعمال بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ سوشل میڈیا نے نوجوانوں کو زیادہ باخبر اور سوال کرنے والا بنا دیا ہے۔ ہماری نسل میں معلومات کے ذرائع محدود تھے۔ ہمارے سامنے بنیادی طور پر ایک ہی ذریعہ تھا، مثلاً پاکستان ٹیلی وژن اور اسی کے ذریعے ہمیں ایک مخصوص بیانیہ ملتا تھا۔ آج صورتحال بالکل مختلف ہے۔ اس وقت جتنی آنکھیں میرے سامنے بیٹھی ہیں، اتنے ہی موبائل فون بھی موجود ہیں۔ ہر موبائل فون ایک کیمرہ ہے اور ہر کیمرہ ایک ممکنہ ذریعۂ اطلاعات اور ایک ممکنہ بیانیے کا مرکز بن سکتا ہے۔ اب بیانیہ صرف چند اداروں یا افراد کے ہاتھ میں نہیں رہا۔ عام لوگ بھی اپنے تجربات، مشاہدات اور معلومات دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ جب کسی واقعے کے بارے میں عوامی سطح پر مختلف آوازیں سامنے آتی ہیں تو اس سے معاملات کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور معاشرے میں اصلاح کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر سوشل میڈیا کو ذمے داری کے ساتھ استعمال کیا جائے تو یہ صرف معلومات کا ذریعہ نہیں، بلکہ معاشرتی احتساب، آگاہی اور خود اصلاح کا ایک مؤثر وسیلہ بھی بن سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کی طاقت کو سمجھیں اور نئی نسل کو اس کے مثبت اور ذمے دارانہ استعمال کی طرف لے جائیں۔

لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین الدین حیدر
اسپیکر ہمدرد شوریٰ، کراچی

فلم، ڈراما اور تھیٹر معاشرے پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ یہ اثر مثبت بھی ہوسکتا ہے اور منفی بھی، اس لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم اپنی نئی نسل کے سامنے کس قسم کا مواد پیش کر رہے ہیں۔

اکثر یہ بات کی جاتی ہے کہ پاکستان میں بعض

غیر اخلاقی نوعیت کی فلمیں یا ویڈیوز بہت زیادہ دیکھی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں صرف یہ دیکھنا کافی نہیں کہ کسی مواد کو کتنے لوگوں نے دیکھا، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کسی ملک کی آبادی میں کتنے فیصد لوگ اس منفی رجحان میں مبتلا ہیں اور اس کے برے اثرات معاشرے میں کس حد تک پھیل رہے ہیں۔

میرے نزدیک ایک اچھی فلم یا ڈراما وہ ہے جسے ایک خاندان اپنے بچوں اور بیٹیوں کے ساتھ بیٹھ کر اطمینان سے دیکھ سکے۔ اگر کسی پروگرام یا فلم میں ایسا منظر آجائے جسے دیکھتے ہوئے والدین اپنے بچوں کے سامنے شرمندگی محسوس کریں تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا وہ مواد واقعی ہمارے معاشرے کے لیے مناسب ہے۔

ہماری فلمی تاریخ میں ایسے ادوار بھی گزرے ہیں جب ایک مخصوص قسم کی ایکشن فلموں نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ سلطان راہی کی فلموں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان فلموں میں تشدد، قتل وغارت، مار دھاڑ اور بعض اوقات نامناسب مناظر شامل ہوتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ فلمیں عوام میں بہت مقبول رہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عوامی مقبولیت اور معاشرتی طور پر مثبت مواد ہمیشہ ایک ہی چیز نہیں ہوتیں۔ اسی طرح تھیٹر نے بھی بعض ادوار میں ہمارے معاشرتی مزاج کو متاثر کیا۔ خاص طور پر لاہور کے بعض علاقوں میں ایسے تھیٹرز قائم ہوئے جہاں انتہائی سطحی اور غیر معیاری مواد پیش کیا جاتا تھا۔ حکومت کو بھی اس صورتحال پر قابو پانے کے لیے اقدامات کرنا پڑے۔ میرے خیال میں اخلاقیات کا بنیادی تصور ہر معاشرے میں موجود ہوتا ہے۔ ہر معاشرہ جانتا ہے کہ کیا درست ہے اور کیا غلط، ہم اپنے بچوں سے کیا کرنے کی توقع رکھتے ہیں اور کن کاموں سے انہیں روکنا چاہتے ہیں۔ اسی بنیادی اخلاقی شعور کو سامنے رکھتے ہوئے فلم، ڈراما اور تھیٹر کے مواد کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہاں سنسر بورڈ اور متعلقہ اداروں کی ذمے داری بھی اہم ہو جاتی ہے۔ اگر کسی فلم یا دوسرے ذرائع سے آنے والے مواد میں ایسی چیز موجود ہو جو اخلاقی اعتبار سے نامناسب ہو، معاشرے پر منفی اثر ڈال سکتی ہو یا ہماری ثقافت اور مذہبی اقدار سے مطابقت نہ رکھتی ہو تو متعلقہ اداروں کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ایسے مواد کو ضرورت کے مطابق حذف، محدود یا روکنے کے لیے مؤثر نگرانی ضروری ہے۔ اس معاملے میں بنیادی مقصد اظہار کو روکنا نہیں، بلکہ اچھے اور مثبت مواد کو فروغ دینا اور منفی اثرات رکھنے والے مواد کی حوصلہ شکنی کرنا ہونا چاہیے۔ فلم، تھیٹر اور ڈراما معاشرے کی سوچ اور مزاج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر ان کے ذریعے اچھی اقدار، مثبت کردار اور تعمیری خیالات کو اجاگر کیا جائے تو یہ معاشرے کی اصلاح میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ان میں منفی رویوں اور نامناسب مواد کو مسلسل نمایاں کیا جائے تو اس کے برے اثرات بھی مرتب ہوں گے۔ لہٰذا ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری فلم، تھیٹر اور ڈراما انڈسٹری ایسی تخلیقات سامنے لائے جو تفریح کے ساتھ ساتھ معاشرے میں مثبت سوچ اور بہتر اخلاق کو بھی فروغ دیں۔

بریگیڈیئر (ر) طارق خلیل
رکن ہمدرد شوریٰ، کراچی

میری ریٹائرمنٹ کو تقریباً 32 سال گزر چکے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میری زندگی میں ایک بڑی تبدیلی آئی اور میں نے فوج سے سول معاشرے کی طرف منتقلی کا تجربہ کیا۔ اس دوران مختلف کمپنیوں میں کارپوریٹ سربراہ کی حیثیت سے کام کیا اور بعد ازاں صحافت سے بھی وابستہ ہوا۔ میری دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ایک اور کتاب بھی زیرِ تکمیل ہے، جس میں میرے ان مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو اسی نوعیت کے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرا مقصد پہلے سے بیان کی گئی باتوں کو دہرانا نہیں، بلکہ میڈیا اور معاشرے کے تعلق کو ایک مختلف زاویے سے دیکھنا ہے۔ اپنے پیشہ ورانہ سفر کے دوران مجھے ایسے اداروں میں بھی کام کرنے کا موقع ملا جہاں معلومات کے حصول، تجزیے اور انٹیلی جنس گیدرنگ جیسے معاملات کا براہِ راست تعلق تھا۔ اس تجربے نے مجھے یہ سمجھنے میں مدد دی کہ اطلاعات اور میڈیا کسی معاشرے پر کس قدر گہرا اثر ڈال سکتے ہیں۔ آج کا ڈراما، فلم یا میڈیا صرف اس لیے نہیں بنایا جاتا کہ وہ ہمیں کوئی سبق سکھائے۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ ایک پہلو تفریح کا ہے، دوسرا معاشرتی، تیسرا عصری اور حالاتِ حاضرہ سے متعلق، جب کہ چوتھا اہم پہلو معاشی

ہے۔ایک پروڈیوسر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی سرمایہ کاری واپس حاصل کرے اور اس کے لیے بنائی گئی فلم یا ڈراما مالی طور پر کامیاب ہو۔

ہم نے اپنے سامنے میڈیا کی دنیا کو کئی مراحل سے گزرتے دیکھا ہے۔ ایک وقت تھا جب چھوٹے شہروں میں چھوٹے اسٹیج پر تھیٹر ہوا کرتا تھا۔ پھر خیموں میں ٹاکیز اور سینما دیکھنے کا دور آیا، اس کے بعد بڑے سینما وجود میں آئے اور پھر ٹیلی وژن ہماری زندگی کا حصہ بن گیا۔ 1964ء میں جب بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی وژن آیا تو پورا محلّہ ایک جگہ بیٹھ کر اسے دیکھتا تھا۔ آج ہم بالکل ایک نئی دنیا میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ مصنوعی ذہانت کا دور ہے۔ ٹیکنالوجی نے میڈیا کے اثرات اور اس کے پھیلاؤ کو پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور بنا دیا ہے۔ مصنوعی ذہانت اور سوشل میڈیا کے موجودہ نظام میں ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ ہماری پسند اور دلچسپیوں کو مسلسل سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم جو کچھ دیکھتے، تلاش کرتے یا پسند کرتے ہیں، اسی بنیاد پر ہمیں مزید اسی نوعیت کا مواد دکھایا جاتا ہے۔ یوں ایک خاص قسم کا مواد بار بار ہماری نظروں کے سامنے آتا رہتا ہے اور آہستہ آہستہ ہمارے خیالات اور ترجیحات پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس لیے آج میڈیا کو صرف تفریح کا ذریعہ سمجھنا درست نہیں۔ اس کے معاشرتی، معاشی، سیاسی اور تزویراتی استعمال بھی موجود ہیں۔ حالیہ برسوں میں ایسی فلمیں بھی بنائی گئی ہیں جن میں پاکستان کے بارے میں ایک مخصوص منفی تاثر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح جنگوں اور سیاسی تنازعات کے حوالے سے مختلف بیانیے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں صرف فلم ہی نہیں، بلکہ سوشل میڈیا پر چلنے والی خبریں اور افواہیں بھی معاشرے میں انتشار پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ کسی معروف شخصیت کے انتقال کی جھوٹی خبر پھیلانا یا کسی واقعے کے بارے میں غیر مصدقہ معلومات کو بڑے پیمانے پر پھیلانا بھی ایک مخصوص مقصد کے تحت معاشرے میں بے چینی پیدا کر سکتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں جاری تنازعات، خصوصاً جنگوں کے دوران مختلف ذرائع سے مختلف بیانیے سامنے آتے ہیں۔ اگر ہم مختلف نیوز چینلز، سوشل میڈیا پلیٹ فارمز اور دیگر ذرائع کا جائزہ لیں تو ہمیں ایک ہی واقعے کی کئی مختلف تشریحات نظر آتی ہیں۔

آج کی نوجوان نسل ایک ایسی دنیا میں پروان چڑھ رہی ہے جو ہماری نسل سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارا دور نسبتاً سادہ تھا، لیکن آج ایک کم عمر بچہ بھی ایسی معلومات تک رسائی رکھتا ہے جن کے بارے میں شاید ہماری نسل نے اعلیٰ تعلیم کے دوران بھی نہ پڑھا ہو۔ اس لیے یہ توقع کرنا درست نہیں کہ آج بننے والا ہر ڈراما صرف ہماری پسند کے مطابق معاشرے کی اصلاح کے لیے بنایا جائے گا۔ میڈیا کے مقاصد اور استعمال بہت وسیع ہو چکے ہیں۔ اس میں تفریح بھی ہے، معاشرتی اثر بھی، معاشی مفاد بھی، سیاسی استعمال بھی اور تزویراتی پہلو بھی۔ آخر کار فیصلہ ہمیں خود کرنا ہے کہ ہم کیا دیکھتے ہیں، کس معلومات پر یقین کرتے ہیں اور کس مواد کو اپنے ذہن پر اثر انداز ہونے دیتے ہیں۔ موجودہ دور میں میڈیا کی طاقت کو سمجھنا اور معلومات کے درست اور غلط استعمال میں فرق کرنا پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر خالدہ غوث
رکن ہمدرد شوریٰ، کراچی

میں اس وقت کچھ پریشان بھی ہوں اور حیران بھی کہ پاکستان کو وجود میں آئے اتنے برس گزرنے کے باوجود ہم آج بھی بہت بنیادی اور ابتدائی نوعیت کے سوالات میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہمارے سامنے نوجوان نسل موجود ہے، لیکن اس کے باوجود ہم اب تک یہ واضح طور پر طے نہیں کر سکے کہ ہم کس قسم کا معاشرہ چاہتے ہیں۔ آج کی گفتگو سے بھی یہی محسوس ہوا کہ ہماری بحث ابھی اس بنیادی سوال کے گرد گھوم رہی ہے کہ میڈیا کی مختلف صورتیں کس طرح کام کریں اور ہم ان سے کیا توقع رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم میڈیا کو محض اپنی پسند اور ناپسند کے بیانیے تشکیل دینے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں یا اسے معاشرے میں مختلف نقطۂ نظر پیش کرنے اور لوگوں کو سوچنے کی ترغیب دینے کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ آزادیٔ اظہار اور تخلیقی صلاحیت انتہائی ضروری ہیں۔ تحریر ہو، گفتگو ہو، فلم ہو یا ڈراما، تخلیق ہمیشہ ایسے ذہن کی متقاضی ہوتی ہے جو سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر ہم تخلیقی صلاحیت کو محدود کر دیں گے تو ہم معاشرے میں نئے خیالات اور نئے زاویۂ نظر پیدا کرنے

کی صلاحیت بھی محدود کر دیں گے۔ خاص طور پر ڈراموں کے حوالے سے میری ایک بنیادی تشویش یہ ہے کہ وہ خواتین کو بااختیار بنا رہے ہیں یا ان کی حیثیت کو مزید کمزور کر رہے ہیں۔ میرے لیے اصل سوال یہ نہیں کہ ڈرامے میں عورت نے کیا لباس پہنا ہوا ہے یا اسے کس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ میرا اصل سوال یہ ہے کہ کیا وہ کردار ایک عورت کو سوچنے، فیصلہ کرنے اور اپنے مقام کو سمجھنے کی طاقت دے رہا ہے یا اسے محض ایک شے اور قابلِ استعمال کردار کے طور پر پیش کر رہا ہے؟ یہی وہ سوال ہے جس پر ہمیں سنجیدگی سے بحث کرنی چاہیے۔

میری دوسری تشویش یہ ہے کہ ہم میڈیا کے مختلف ذرائع کو اپنے پسندیدہ بیانیوں کو بنانے، فروغ دینے اور مقبول کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں یا ان ذرائع کے ذریعے معاشرے میں مختلف نقطۂ نظر پیش کر رہے ہیں، تاکہ لوگ ان پر غور کریں۔ اگر مختلف خیالات اور زاویے معاشرے تک پہنچیں اور لوگوں کو سوچنے کا موقع ملے تو اس سے ایک باشعور معاشرہ تشکیل پانے میں مدد مل سکتی ہے۔

آج کی اس گفتگو میں نوجوانوں کی موجودگی نے مجھے مزید سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ بحث صرف بزرگوں یا پہلے سے قائم اداروں کے درمیان نہیں ہونی چاہیے۔ نوجوان بھی اس معاشرے کا حصہ ہیں اور مستقبل کے معاشرے کی تشکیل میں ان کا کردار بنیادی ہے۔ اگر ہم آج کے موضوع میں اصلاح کی بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہم کس معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں؟ جب ہم نے اب تک یہ طے ہی نہیں کیا کہ ہمارا مطلوبہ معاشرہ کیسا ہونا چاہیے تو پھر اصلاح کا معیار بھی واضح نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس گفتگو میں اسلام کا حوالہ بھی سنا اور ایک مخصوص مشرقی اور روایتی معاشرے کی بات بھی ہوئی۔ میرے خیال میں ہمیں یہ بھی واضح کرنا ہوگا کہ ہم کن اقدار کو اپنے معاشرے کی بنیاد بنانا چاہتے ہیں۔ میں ماضی میں میڈیا اور تعلیم کے حوالے سے تشکیل دی جانے والی حکومتی کمیٹیوں کا بھی حصہ رہی ہوں۔ ان تجربات کے دوران یہ محسوس ہوا کہ جب حکومتی اداروں کی طرف سے واضح ہدایات یا پالیسی ڈائریکٹیوز آتے ہیں تو ان کی اپنی ایک نوعیت ہوتی ہے، لیکن جب معاشرہ خود ایسے معاملات میں الجھ جائے تو صورتحال مزید پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ تعلیم کے حوالے سے بھی میری ایک بنیادی سوچ ہے۔ اگر ہم کہتے ہیں کہ طلبہ کی کردار سازی اسلامی اصولوں پر ہونی چاہیے تو اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نوجوانوں کو کچھ مخصوص تصورات یاد کرا دیں۔ ایک مسلمان معاشرے میں میری خواہش ضرور ہے کہ تعلیمی ادارے سے نکلنے والا نوجوان ایک اچھا انسان ہو، کسی کو نقصان نہ پہنچائے اور اپنی ذمے داری کو سمجھے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر سوچنے والا ذہن موجود ہو۔ ایک استاد کا فرض صرف معلومات منتقل کرنا نہیں، بلکہ طالب علم کو مختلف نقطۂ نظر سے روشناس کرانا، اسے علم دینا اور اس کے اندر سوال کرنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا بھی ہے۔ ہمیں ایسے نوجوان پیدا کرنے ہیں جو اپنی سوچ رکھتے ہوں، اپنے فیصلے خود کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور معاشرے میں ایک باشعور فرد کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کر سکیں۔ میرا کام یہ نہیں کہ میں طالب علم کو محض رٹا لگا کر معاشرے میں بھیج دوں۔ میرا کام یہ ہے کہ میں اسے سوچنے والا ذہن دوں۔ میرے نزدیک ایک مضبوط معاشرہ وہی ہے جہاں آزادئ اظہار، تخلیقی صلاحیت، علم، مختلف نقطہ نظر اور تنقیدی سوچ ایک دوسرے کے ساتھ موجود ہوں۔ اگر ہم واقعی اصلاح چاہتے ہیں تو ہمیں پہلے اپنے مطلوبہ معاشرے کی واضح تصویر بنانا ہوگی اور پھر میڈیا اور تعلیم دونوں کو اس معاشرے کی تعمیر کے لیے ذمے دارانہ انداز میں استعمال کرنا ہوگا۔